راوی فاؤنڈیشن کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 24 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عید مبارک

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ
عامر بن علی

مدیران
حسن عباسی
لبنیٰ صفدر

اپریل ۲۰۲۳ء

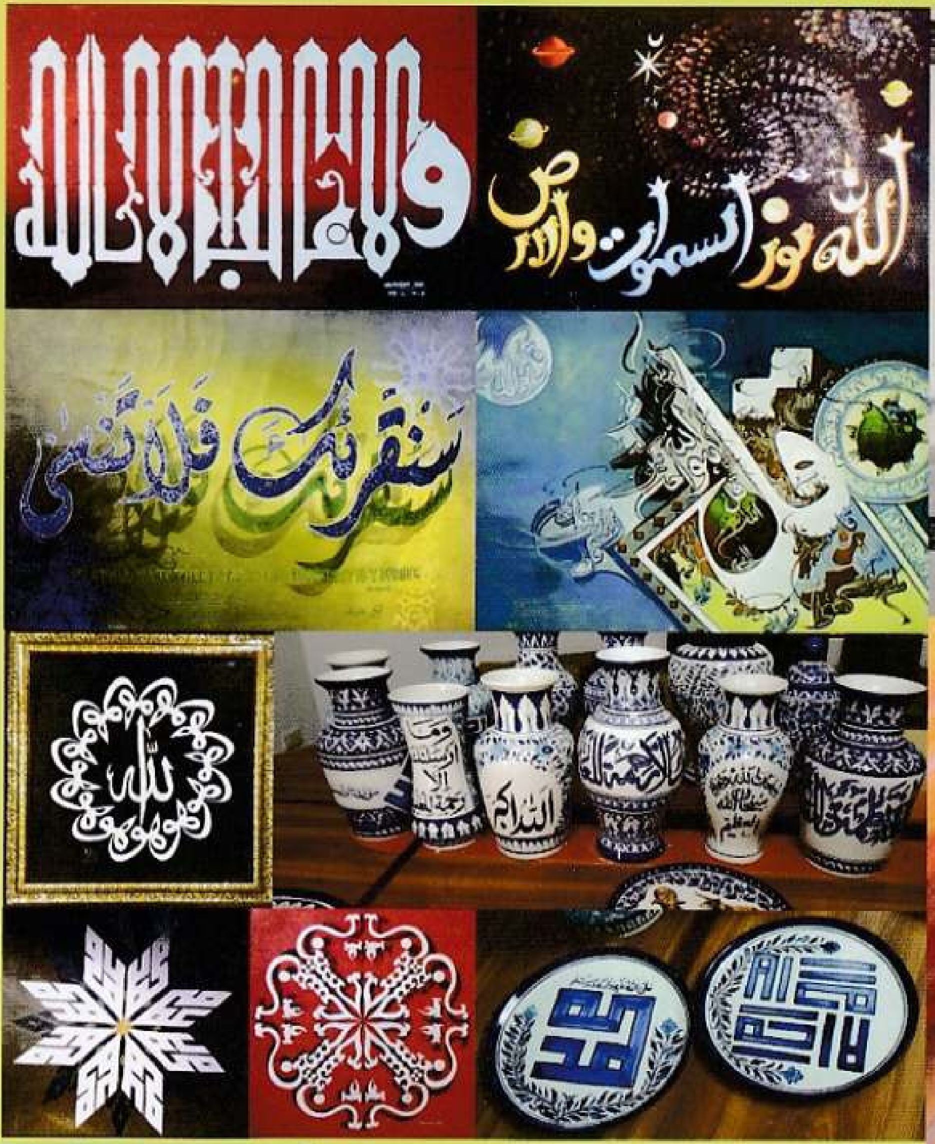

عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط، ظروف نگار اور استادِ فن

منشاء یاد سے گپ شپ

اپنا حقیقی تخلیقی جوہر تلاش کرنے میں وقت اور جدوجہد درکار ہوتی ہے

کلر بلائینڈ ہونے کے سبب رنگوں کی دنیا میں خود کو منوانا آسان نہیں تھا

آرٹ گیلری کے قیام کا مقصد نو واردان کی رہنمائی کے علاوہ اسلاف کی روایت کی آبیاری تھا

تحریر:۔ عامر بن علی

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے طرفدار بھی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط اور ظروف نگار منشاء یاد کا نام آرٹ سے وابستہ لوگوں کے لئے جانا پہچانا اور معتبر ہے۔ میری ان سے ایک خصوصی نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ میاں چنوں ہم دونوں کی مشترکہ جنم بھومی ہے۔ کئی عشروں سے منشاء یاد کیلی گرافی، پورٹریٹ، سکیچز، بلیو پوٹری اور دیگر متعدد شعبہ ہائے فن میں اپنا تخلیقی سفر بڑی شد و مد اور محنت و محبت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ارتقائی سفر ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اب اوجِ کمال پر پہنچ چکا ہے۔ مقامی، قومی اور عالمی سطح پر ان کے فن پاروں کی بے شمار نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مسلسل اشاعت کا 24 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد 24 مئی 2023 شمارہ 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیران ◉ حسن عباسی ◉ لبنیٰ صفدر

{ مجلس ادارت }

ڈاکٹر جعفر حسن مبارک ● سعدیہ سیٹھی

{ مجلس مشاورت }

ظفر خان (امریکہ) ● ارشد نذیر ساحل (کینیڈا)

کمپوزنگ ● رباب کمپوزنگ : 0321-4730769 ڈیزائنر ● نعمان حسن :0333-4918383

سرورق: عمران شناور

پتہ برائے خط کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیصل سنٹر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

حسن عباسی: 0300-4489310 عارف کاظمی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبر شپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ ممبر بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی پر سالانہ -/1000 روپے
بذریعہ ایزی پیسہ، موبائل کیش، یو پیسہ، یا یو بی ایل اومنی سے رقم بھیجیں اور ساتھ نمبر ارسال کریں۔ رسالہ آپ کو بھیج دیا جائے گا۔

حسن محمود 0300-4489310 شناختی کارڈ نمبر 31204-7298386-9

فہرست

حمد، نعت ، 2

گوشۂ نعت: ○ جمیل یوسف ، ابوالحسن خاور ، 4 تا 5

مضامین: ○ امجد اسلام امجد (مرحوم) / پروفیسر انور مسعود ، 6

○ زیر لب کچھ بیان بولتے ہیں: بسمل صابری کی شاعری / ڈاکٹر سعادت سعید ، 8

○ پاکستانی زبانوں کے مابین لسانی اشتراک: تحقیقی اور ثقافتی امکانات / ڈاکٹر ناصر عباس نیر ، 11

○ اقبال اور اصحاب رسول ﷺ (سیدنا صدیق اکبرؓ) / ڈاکٹر تفاخر محمود گوندل ، 14

○ بلوچستان کا فارسی گو شاعر اور غالب کا پہلا معترض مولانا میرزا گل محمد ناطق مکرانی / مرزا کاظم رضا بیگ ، 18

شعری گوشے: عماد اظہر، اویس ضمیر، پروفیسر محمد خالد کھوکھر ، 22 تا 24

طنز و مزاح: ○ سگریٹ نوشی / عطاء الحق قاسمی ، 25

○ میں عام آدمی ہوں مجھے مار ڈالیے / پروفیسر نور کمال شاہ ، 26

○ نور نہایا رستہ......جلیل عالی / شاعر علی شاعر ، 28

○ صاحب وسائیں / شاکر کنڈان ، 34

○ شاہین کی شعری پرواز / عبدالوحید بسمل ، 36

شاعری 39 تا 40

افسانے ○ پرانی چیز / اظہر جاوید / ترجمہ: حنیف باوا ، 41

○ ایک اچھے شہری کی موت / محمد یحییٰ (اومان) ترجمہ: محمد افتخار شفیع ، 45

○ دودھ شریک / علی انور احمد ، 46

○ سراندیپ سے سری لنکا تک / طاہر انور پاشا ، 50

انٹرویو: منشا یاد سے گپ شپ / عامر بن علی ، 52

○ بقیہ انٹرویو: نصیر احمد ناصر / لبنیٰ صفدر ، 53

○ مختصر ادبی خبریں ، 56

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد و نعت

اللہ نور خود ہے خالق بھی نور کا ہے
لاریب وہ ہی مالک یومِ نشور کا ہے
شمس و قمر ستارے امرِ خدا کے مظہر
ہر ایک شے میں جلوہ خالق کے نور کا ہے
حاضر وہی ہے ہر جا لیکن نظر سے پنہاں
انداز کیا نرالا اس کے ظہور کا ہے
ارض و سما میں ہر سو حُسن و بہا اسی سے
ہر اک جہان مظہر اس کے ہی نور کا ہے
مسجود وہ حقیقی ، معبود وہ ہی تنہا
حاکم وہی حقیقی سارے اُمور کا ہے
سنتا ہے وہ ہی اخترؔ مخلوق کی دُعائیں
سب پہ کرم جہاں میں ربِ غفور کا ہے

جسٹس (ر) **میاں نذیر اختر**/ لاہور

خزاں کو سبزگی ، شب کو ضیا تقسیم کرتا ہے
سبھی سائل ہیں اور میرا خدا تقسیم کرتا ہے
کبھی وہ مہرباں دامان بھر دیتا ہے لمحوں میں
کبھی وہ مرحلہ در مرحلہ تقسیم کرتا ہے
وہ ہر بڑھتے ہوئے کشکول کی غایت سمجھتا ہے
کہیں دولت ، کہیں صبر و رضا تقسیم کرتا ہے
اسی کی بندگی میں وصف ہے لذت رسانی کا
وہ میرے آنسوؤں میں ذائقہ تقسیم کرتا ہے
وہ پہلے ہی بتا دیتا ہے دائیں سمت مڑنا ہے
پھر اس کے بعد سیدھا راستہ تقسیم کرتا ہے
کوئی مانگے تو خالق سب خزانے کھول دیتا ہے
خدا دیتا ہے محبوبِ خدا تقسیم کرتا ہے

ابوالحسن خاور/ لاہور

دِل کے چمن پہ چھایا ہوا کیا نکھار ہے
عشقِ نبیؐ کے فیض سے دِل میں بہار ہے
صد شکر دَور ختم ہوا اضطراب کا
پایا درِ حضورؐ پہ طُرفہ قرار ہے
آسان ہو گئیں مِری عقبیٰ کی منزلیں
نسبت نبیؐ کے نام سے اب اُستوار ہے
بکھری ہیں کائنات میں ہر سمت رحمتیں
خیر البشرؐ کے فیض سے ہر سُو بہار ہے
رُخ اس کا سُوئے گنبدِ خضریٰ سدا رہے
سر سبز سر زمینِ دلِ پُر بہار ہے
عشقِ نبیؐ ملے جسے وہ خوش نصیب ہے
باغِ اِرم میں اُس کی جگہ شاندار ہے
آئے بُلاوا پھر مجھے شہرِ حبیبؐ سے
اخترؔ اسی کرم کا مجھے انتظار ہے

جسٹس (ر) **میاں نذیر اختر**/ لاہور

اک یاد سے اس دل میں بہار آئی ہوئی ہے
اک ذات نے دنیا مری مہکائی ہوئی ہے
کس کس نے اُٹھایا نہیں فیضانِ مدینہ
کس کس کی نہ اس در پہ پذیرائی ہوئی ہے
حسرت نہ رہی اور کسی چیز کی جب سے
جھولی درِ سرکارؐ پہ پھیلائی ہوئی ہے
اس شخص کی سانسوں سے نہ کیوں خوشبوئیں پھوٹیں
وہ جس نے مدینے کی ہوا کھائی ہوئی ہے
احساسِ ندامت سے ہوں بے حال، کرم ہو
بے چین ہے دل، جان بھی گھبرائی ہوئی ہے
ظلمت کا نشاں اس کے قریب آ نہیں سکتا
جس نے درِ اقدس سے ضیا پائی ہوئی ہے
پھر قلبِ پریشاں کو رہائی ملی غم سے
پھر دشتِ دل و جاں میں بہار آئی ہوئی ہے

علی رضا/ ساہیوال

نیچی رکھ اپنی نظر ، چل سر کے بل
یہ نبیؐ کا ہے نگر ، چل سر کے بل
یہ زمیں ، عرشِ بریں ہے بالیقیں
اے مِرے قلب و نظر! چل سر کے بل
پھر سے شہرِ مصطفیٰؐ سے، بادِ صبح!
بن کے آؤ نامہ بر، چل سر کے بل
خوش نصیبی کہ خیال و خواب میں
آ گیا طیبہ نگر، چل سر کے بل
بارگاہِ عشق سے ہر دم طلب
تو مرادِ عشق کر ، چل سر کے بل
چُوم لینا منتِ درباں کے ساتھ
ہاں، درِ خیر البشرؐ چل سر کے بل
شافعِ محشر کو ہوگی حشر میں
ہم غلاموں کی خبر چل سر کے بل
اب خیالاتِ مدح میں مرحبا
سلسلہ ہے خُوب تر چل سر کے بل

تجھ پہ حضرت آمنہؓ کے لال کی
لطف کی، زائرؔ نظر چل سر کے بل

عبدالقیوم زائر/امریکا

عشق رسولؐ عشق میں ہے اوّلیں چراغ
یہ ماجرا کھلا تو ہوئی ہے جبیں چراغ
دل ہے تو روشنی کی تمنا بھی دل میں ہو
حسنِ طلب نہیں ہے تو جلتا نہیں چراغ
رکھتے ہیں یہ طریق غلامانِ مصطفیٰؐ
ظلمت جہاں بھی دیکھی جلایا وہیں چراغ
ملتا ہے درس گاہِ نبیؐ سے یہی سبق
وہم و گماں اندھیرا ہے اور ہے یقیں چراغ
دل میں اُجال دے جو محبت رسولؐ کی
تم ڈھونڈ لو ندیمؔ جو ایسا کہیں چراغ

ریاض ندیم نیازی/سبی

شہر خیر الوریٰ دیکھتے رہ گئے
چاند تارے ضیا دیکھتے رہ گئے
صوتِ اقرا کے آہنگ سے روح القدس
شانِ غارِ حرا دیکھتے رہ گئے
جالیوں سے سدا اہلِ عشاق ہی
نور کا سلسلہ دیکھتے رہ گئے
کر کے ہجرت گئے ہیں رسولِ خدا
رات کفار کیا دیکھتے رہ گئے
سارے کفار ششدر ہوئے رات کو
چاند شق ہو گیا دیکھتے رہ گئے
سنگِ اسود کے ثالث کی کیا شان ہے
گو عدو فیصلہ دیکھتے رہ گئے
خاندانِ رسولؐ خدا کی ادا
اہلِ نجراں سدا دیکھتے رہ گئے
نعت ساجدؔ ہوئی نہ جڑے ہونٹ ہی
لوگ حسن ادا دیکھتے رہ گئے

محمد امین ساجد سعیدی/حاصل پور

گر چاہیے ہے تجھ کو شفاعت رسولؐ کی
پھر صدقِ دل سے کر تو اطاعت رسولؐ کی
بعد از خدا تو مرتبہ بس آپؐ ہی کا ہے
کیسے بیان مجھ سے ہو عظمت رسولؐ کی
ہیں شاہِ دو جہاں کی غذا سوکھی روٹیاں
یہ سادگی رہی ہے معیشت رسولؐ کی
محفوظ کر لیں سینوں میں اپنے بھی ہم اسے
رب کا کلام تو ہے امانت رسولؐ کی
جتنا بھی اس پہ فخر کروں کم ہے دوستو
شامل ہے میرے نام میں نسبت رسولؐ کی
مولا کریم اپنا کرم کر تو رات دن
مشکل میں رات دن ہے یہ اُمت رسولؐ کی
خوش بخت خوش نصیب صحابہؓ ہیں کس قدر
دیکھی انہوں نے آنکھوں سے صورت رسولؐ کی
اُس کے لیے ہیں دونوں جہاں کتنے خوش نما
مل جائے آسیؔ جس کو محبت رسولؐ کی

عدیل احمد آسی/ڈنمارک

سنی جائے گی عرش پر لکھ رہا ہوں
میں توصیفِ خیر البشر لکھ رہا ہوں
کریں گے مداوا وہی دردمندو!
دکھوں کا انہیں چارہ گر لکھ رہا ہوں
عریضہ مرا لے کے جائے گی اک دن
صبا ہے مری نامہ بر لکھ رہا ہوں
رواں ہے قلم ذکر شاہِ عرب میں
مجھے آ گیا ہے ہنر لکھ رہا ہوں
نظر آئے شایانِ شانِ محمدؐ
میں ہر لفظ کو جانچ کر لکھ رہا ہوں
تخیل مجھے لے گیا ہے فلک پر
جو آیا ہے پیشِ نظر لکھ رہا ہوں
نگاہوں میں صورت بٹھا لی ہے عابدؔ
ہے سیرت پہ میری نظر لکھ رہا ہوں

عابد سیال/خیر پور ٹامے والی

آپ کے لطف سے حالات بدل جائیں گے
واہ کیا بات ہے ہم لوگ سنبھل جائیں گے
نعرہ تکبیر و رسالت کا لگے گا جب بھی
کفر کے دل بھی جہاں بھر میں دہل جائیں گے
روز جیتے ہیں یہی آس کا پی کر پیالہ
نہ سہی آج اگر طیبہ میں کل جائیں گے
گنبدِ خضریٰ جب آنکھوں میں سما جائے گا
میرے جذبات اسی لمحے مچل جائیں گے
آپ کی یاد کو لفظوں میں سجانا ہے مجھے
خود خیالات مرے نعت میں ڈھل جائیں گے
جس گھڑی آپ کی ہو جائے گی چشمِ اُلفت
گردشِ دوراں سے ہم لوگ نکل جائیں گے
پھول چنتے ہیں سدا صلِ علیٰ کے حالیؔ
لمحے جتنے بھی ہوں مشکل وہ تو ٹل جائیں گے

محمد ذوالقرنین جواد حالی/حاصل پور

اُمّی لقب و قافلہ سالارِ دو عالم
ہے سرِ نبیؐ، پردہ اسرارِ دو عالم
لائے تو دو عالم سے مثال آپؐ کی کوئی
سادہ سی چٹائی پہ ہے دربارِ دو عالم
ہے اس کی نظر، واقفِ ہر اوّل و آخر
ہے اس کی جبیں، کاشفِ اسرار دو عالم
وہؐ مہر مبیں، منبعِ ہر علم و یقیں ہے
وہ روئے حسیں، صبحِ ضیا بارِ دو عالم
ہر عالمِ امکاں ہے اسی ذاتؐ سے پیدا
وہؐ آئینہ ہے مطلعِ انوار دو عالم
انساں پہ ہے یہ آپؐ کا کتنا بڑا احساں
یہ راندۂ فردوس ہے، شہکارِ دو عالم

نئے امکان کے در کھول دیتا ہے کلام اُنؐ کا
حیاتِ تازہ کا مژدہ سناتا ہے پیام اُنؐ کا
جو ہر اک بات سے اچھی ہے وہ ہے صرف بات اُنؐ کی
جو ہر اک نام سے پیارا ہے وہ ہے ایک نام اُنؐ کا
زمانہ آج تک اُنؐ کی طرف حیرت سے تکتا ہے
کہ بالا ہے بہت ہر اک بلندی سے مقام اُنؐ کا
یہ دُنیا لا نہیں سکتی کبھی کوئی مثال اُنؐ کی
ہر اک کارِ نمایاں سے نمایاں تر ہے کام اُنؐ کا
اُنہی کے فیض سے انسان نے انساں کو پہچانا
ہر اک نظمِ حکومت سے ہے بہتر انتظام اُنؐ کا
تمیزِ بندہ و آقا نہیں ہے اُنؐ کی محفل میں
ہے سارے تشنہ کاموں کے لیے گردش میں جام اُنؐ کا
ترقی جو کسی نے کی، اُنہیؐ کی راہ پر چل کر
کیا تاریخ میں اقوام نے یوں احترام اُنؐ کا
وہؐ ہر اک دور میں خورشید کی صورت چمکتے ہیں
زمانے کی جبیں پر ثبت ہے نقشِ دوام اُنؐ کا
وہ اک انسان تھے لیکن کوئی انساں نہیں ایسا
سمجھ سکتی نہیں ہے، عقلِ انسانی مقام اُنؐ کا
بھلا اُنؐ کا مقام و مرتبہ کیا کوئی پہچانے
شہنشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا غلام اُنؐ کا
یہاں ہم تو یونہی بس دو گھڑی کو آن بیٹھے ہیں
یہ بزم اُنؐ کی ہے، باتیں اُنؐ کی، مے اُنؐ کی ہے، جام اُنؐ کا

پھر شجاعت کا دھنی کوئی نہ ایسا نکلا
ساری دنیا کے مقابل وہؐ اکیلا نکلا
ساری دنیا کو عطا کر گیا منزل کا شعور
خلوتِ غارِ حرا سے وہؐ ستارا نکلا
کتنے ہی سوکھے درختوں پہ ثمر لے آیا
دشت سے بادِ بہاری کا وہ جھونکا نکلا
اپنے دشمن کو بھی سینے سے لگایا جس نے
ریگزاروں سے محبت کا وہؐ دریا نکلا
جھوٹ کو اور جہالت کو بھسم کر ڈالا
اس کے ماتھے سے صداقت کا وہؐ شعلہ نکلا
کششِ حسن کے اسرار سمجھ میں آئے
ایک اک نقشِ حسیں اسؐ کا کفِ پا نکلا
اسؐ کے قامت کی بلندی کا ہو کیا اندازہ
ہر نئے دور میں وہؐ اور بھی اونچا نکلا
اسؐ کے اجمال کی تفسیر رقم کیا ہو گی
جو تصور بھی کیا ہم نے اُدھورا نکلا
اس تعلق نے مجھے بخشی بلندی کتنی
جو مرا آقاؐ ہے، محبوب خدا کا نکلا
کب ہوئی نعت میں الفاظ کی حسرت پوری
کب رہِ شوق میں ارمان قلم کا نکلا

ہمیشہ اُنؐ کو اپنا ملجاء و ماویٰ کہا میں نے
محمدؐ سے بھلا کب عشق کا دعویٰ کیا میں نے
غلامانِ محمدؐ مصطفی کا میں سگِ در ہوں
سگِ در سے زیادہ خود کو کب رتبہ دیا میں نے
مری خوش قسمتی ہے گر مجھے اس کی اجازت ہو
محمدؐ کی غلامی کا جو یہ دعویٰ کیا میں نے
میں اک مدت بھٹکتا پھر رہا تھا دشتِ ظلمت میں
بالآخر پا لیا ہے اُنؐ کے در کا راستہ میں نے
نہ رہزن کا کوئی کھٹکا نہ کوئی خوف ہے دل کو
کیا ہے جب سے اُنؐ کے نقشِ پا کو راہ نما میں نے
وہاں میں ان کا ذکر و فکر لے کر بیٹھ جاتا ہوں
بنا رکھا ہے اپنے دل میں اک غارِ حرا میں نے
زمانے کی کوئی آندھی پہنچ سکتی نہیں اُس تک
چراغ اک ایسا اپنے دل میں روشن کر لیا میں نے
نہ مجھ کو زندگی کا غم، نہ مجھ کو موت کا ڈر ہے
محمدؐ کا عطا کردہ سبق جب سے پڑھا میں نے

اسی اُجالے سے منزل کی آگہی ہوئی ہے
تمہارے نقشِ قدم سے جو روشنی ہوئی ہے
تمہارے واسطے دنیا میں جو سجائی گئی
وہ بزمِ کون و مکاں آج تک سجی ہوئی ہے
تم آئے ہو تو اندھیروں کا راج ختم ہوا
تم آئے ہو تو زمانے میں روشنی ہوئی ہے
ہزار شکر کہ میں تیرا نام لیوا ہوں
یہ کیا عظیم سعادت مجھے ملی ہوئی ہے
بلند تر ہوں میں ہر تاج و تخت والے سے
یہ سربلندی مجھے آپؐ ہی نے دی ہوئی ہے
حضورؐ! آپ کے قدموں کی خاک مل جائے
مجھے تو بس اسی دولت کی دھن لگی ہوئی ہے
ترے خیال کی قندیل لے کے نکلا ہوں
اسی کے نور سے رستے میں روشنی ہوئی ہے
جمیلؔ شکر بجا لاؤں کس طرح سے میں
یہ آج میرے قلم سے جو شاعری ہوئی ہے

سب وسیلے مسترد، سارے سہارے مسترد
اک مدینہ کے سوا سارے کنارے مسترد
ان سے نسبت ہوگئی تو غیر کے احسان کیوں
یہ سہارے، وہ سہارے، سب سہارے مسترد
نقش ہے لوحِ بصارت پر مدینہ کا جمال
آنکھ کرتی جا رہی ہے سب نظارے مسترد
طلعتِ خاکِ مدینہ ہے مری آنکھوں کا نور
دیپ، جگنو، چاند، سورج اور ستارے مسترد
رحمتِ سرکار کی تمثیل ممکن ہی نہیں
ساری تشبیہیں معطل، استعارے مسترد
حشر میں تھی رحمۃ للعالمینی اوج پر
ورنہ ہوتے جا رہے تھے گوشوارے مسترد

لولوئے نعت ہے کہیں مرجانِ نعت ہے
دنیا ہے یہ کہ سورہ ء رحمانِ نعت ہے
خاور نظر اٹھا بڑا سامان نعت ہے
ہر شعبہ ء حیات میں امکانِ نعت ہے
پھیلی ہوئی ہیں طٰہٰ و یسیں کی نکہتیں
قرآن اس کنایے میں گل دانِ نعت ہے
ہر نخل میں ہے گنبدِ خضری کی سبزگی
جس سمت دیکھتا ہوں گلستانِ نعت ہے
جتنا ہے جس کا علم وہ اتنا خموش ہے
وہ نعت کیا لکھے جسے عرفانِ نعت ہے
جس میں ہو عکس اسوہ ءسرکارِ دو جہاںؐ
وہ جو بھی ہے جہاں بھی ہے، حسانِ نعت ہے
یہ جو مرے گھرانے میں عشقِ رسول ہے
خاور یہ اور کچھ نہیں فیضانِ نعت ہے

خدا کا شکر کہ نسبت، حضور آپ سے ہے
ہماری جو بھی ہے قیمت، حضور آپ سے ہے
ستارے، چندرما، سورج، چراغ اور جگنو
یہ فرش و بام کی زینت، حضور آپ سے ہے
زمین، آسماں، قلزم، پہاڑ، ابر، ہوا
ہر ایک آیتِ فطرت حضور آپ سے ہے
جمال، سبزگی، رعنائی، نور، تابانی
یہ حسنِ طیبہ، یہ جنت، حضور آپ سے ہے
گناہ، رنج، ملال، اشک، حاضری، توبہ
امیدِ چشمِ براءت، حضور آپ سے ہے
لحد، سوال، قیامت، حساب، فردِ عمل
قدم قدم پہ سہولت حضورؐ آپ سے ہے
غنا، قرار، تشفی، سکون، آسائش
دلوں میں چین کی دولت، حضور آپ سے ہے
خشوع، گریہ، خشیت، خلوص، صدق، صفا
تمام حسنِ عبادت، حضور آپ سے ہے
درود، نعت، قصیدہ، سلام اور قرآن
ہر ایک صنفِ عقیدت، حضور آپ سے ہے

نسبتیں

میرے بیٹے نے سن تو رکھی تھیں
نسبتیں اس سنہری جالی کی
جس کی رنگت پہ صبح کی کرنیں
جان و دل سے نثار ہوتی ہیں
جس کی پہلو میں خلد سمٹی ہے
جس کے روزن سے نور چھنتا ہے
جس کو دیکھیں تو عشق آنکھوں سے
صورتِ اشک آ ٹپکتا ہے
اس نے بچپن سے سن تو رکھی تھیں
نسبتیں اس سنہری جالی کی
ایک دن اذن حاضری جو ملا
دونوں پہنچے دیارِ رحمت پر
ان کی جالی سے کچھ ادھر ہو کر
ہم بھی اشکوں میں نعت کہنے لگے
جانے کس وقت میرے بیٹے نے
پہریداروں کی بے خیالی میں
فقط اک لمسِ شبنمی کے لیے
ماں کے چہرے کو جیسے چھوتے ہیں
چھو لیا اس سنہری جالی کو
پہریداروں سے تو رہا نہ گیا
ایک نے اس کا ہاتھ پکڑا اور
کھینچ کر میرے پاس لے آیا
وہ تھا دربانِ سرورِ عالم
وہ تو شاہوں کو ڈانٹ سکتا تھا
میں تو منگتا تھا ان کی چوکھٹ کا
اور منگتا بھی آخری صف کا

اس کی تالیفِ قلب کی خاطر
اپنے چہرے کو سرخ کرتے ہوئے
آنکھوں آنکھوں میں اپنے بیٹے کو
خوب ڈانٹا۔۔ اور اس کے جاتے ہی
اپنے بیٹے کے ہاتھ چوم لیے

امجد اسلام امجد (مرحوم)

پروفیسر انور مسعود/ اسلام آباد

سامعین گرامی! درست یاد نہیں پڑتا کہ امجد سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی۔ گمان غالب یہی ہے کہ یہ ملاقات انارکلی کے ایبک روڈ پر بشیر منذر کے منار آرٹ پریس پر ہوئی تھی۔ جہاں دن بھر شاعروں اور ادیبوں کا ایک مجمع سا لگا رہتا تھا۔ اللہ کے فضل سے یہ پرخلوص اور صمیمی دوستی پھر عزیزداری میں بدل گئی۔ امجد کی بیٹی روشین میری بہو اور میرا بیٹا محمد عاقب انور امجد کا داماد ہے۔ امجد کی نواسی اور میری پوتی زیبندہ کی ولادت پر میں نے امجد کو ٹیلی فون پر ایک مختصر سا جملہ خبر یہ کہا کہ امجد تمہیں مبارک ہو تم جدِ امجد ہو گئے ہو۔

امجد کے ساتھ میں نے پاکستان اور بیرونِ پاکستان اتنے مشاعرے پڑھے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔ امجد ایک نہایت ہمدرد دوست اور بہت ہی خوشگوار ہم سفر تھا۔ اس کے ساتھ یہ تجربہ بہت ہی فرحت انگیز اور بشاشت آمیز ہوتا تھا۔ اس کی ہمرہی میں سفر کی ساری سعوبت اور کوفت ایک دم معدوم ہو جاتی تھی۔ اس لیے کہ جیسے ہر سال کی جنتری ہوتی ہے امجد کو ہر سال کے تازہ بتازہ اور نو بہ نو لطیفے از بر ہوتے تھے۔

امجد کی ادبی تخلیقی صلاحیتیں اتنی کثیر الجہت، متنوع اور دامن دار ہیں کہ ان کا مکمل احاطہ کرنا انتہائی دشوار ہے۔ ڈرامے کی صنف میں اس نے جو کمال دکھایا ہے میں نے اس کی جہد مسلسل کے بارے میں اس کی زندگی میں کہا تھا:

کیسے ممکن ہے کہ رفع خستگی کے واسطے
دن کا وارث رات کی دہلیز پر بیٹھا رہے

اس ضمن میں امجد کے بارے میں غلام محمد قاصر نے کتنا بلیغ مصرع کہا ہے:

چرخِ تمثیل پہ مہتاب درخشاں ہے وہ نام

جہاں تک امجد کی شاعری کا تعلق ہے وہ اُس کی سب سے زیادہ من بھاتی صنف سخن تھی۔ اس سلسلے میں اُس نے اپنے سامعین اور قارئین کا دائرہ محدود نہیں ہونے دیا۔ بزرگ بھی اس کے مداح ہیں۔ نوجوان بھی اُس کی محبت بھری نظموں اور غزلوں کے متوالے ہیں اور بچوں کو بھی اُس کے شعر از بر ہیں۔

سامعین گرامی! ٹالسٹائی کا قول ہے کہ کسی ادبی فن پارے کی اہمیت اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ کتنے لوگوں نے سراہا ہے۔ امجد کی شاعری اس معیار کی پوری ترجمانی کرتی ہے۔ ضمیر جعفری صاحب نے تو امجد کی ہمہ گیر پہنائی فکر کو 'امجد ستان' کا نام دیا ہے۔

حاضرین محترم! بڑا آدمی وہ ہوتا ہے جس کے رُخصت ہونے کے بعد اُس کی جگہ خالی رہے۔ امجد ایک ایسا ہی بڑا آدمی تھا۔ بڑے بلند پایہ ادیبوں اور شاعروں نے اُس کی تخلیقات کی دلکشی کا کھل کر اعتراف کیا ہے۔ اس فہرست میں فیض احمد فیض بھی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی بھی۔ شہزاد احمد بھی مشتاق احمد یوسفی بھی اور امجد کی منہ بولی بہن پروین شاکر بھی۔ عجیب اتفاق ہے کہ فیض احمد فیض صاحب اور اختر حسین جعفری صاحب نے ایک ہی لفظ کے وسیلے سے بڑا عمیق اور خوبصورت بصرہ تجزیہ کیا ہے۔ دونوں نے یہی کہا ہے کہ امجد بڑی سہولت سے لکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے یہ سہولت اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب شاعر کے صریرِ قلم میں نوائے سروش گھل مل جاتی ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں کہیے کہ شاعر کی کاوش میں قدرت اپنا حصہ ڈال دیتی ہے۔

امجد کے فن اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر امجد فہمی کے نام سے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا ایک نادر ہدیہ تحسین ہے۔ سات سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب بڑی محبت اور محنت سے لکھی گئی ہے۔ ڈیڑھ سو سے زیادہ صفحات پر مشاہیر کے ساتھ امجد کی تصویروں کا البم بھی اس میں شامل ہے۔

امجد نے اپنے دور کی ادبی تاریخ کو اپنے کالموں میں بڑی خوش اسلوبی سے قلمبند کر دیا ہے۔ اسے جدید فارسی کی اصطلاح میں محافظ کاری کہتے ہیں۔ امجد نے یہ کام اس طرح سرانجام دیا ہے کہ غالب کا مصرع یاد آتا ہے۔

منتے ہر قدم راہ روان است مرا

ایک مترجم کی حیثیت سے بھی امجد کے کارنامے انتہائی قابلِ تحسین ہیں۔ ان کا مجموعہ عکس فلسطینیوں کے جذبہ حریت اور ان کے استحصال شکن رویے کی بہترین ترجمانی ہے۔ ''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' سیہ فام لوگوں کا کرب انگیز نعرۂ حریت ہے۔ ان نظموں کے تراجم کا انتساب امجد نے کتنے روشن لفظوں سے کیا ہے۔ ''اس لمحے کے نام جب حضرت بلال حبشیؓ نے کعبے کی چھت پر کھڑے ہو کر پہلی اذان دی تھی۔''

امجد کی حمدیہ، نعتیہ اور صنفِ سلام کی شاعری کے

حوالے سے جناب فتح محمد ملک نے کیا عمدہ تبصرہ کیا ہے کہ "امجد کی تمناؤں کی کھیتی نسبت محمدیؐ سے ہری ہے"

امجد کے دریائے تحریر کی ساری موجوں کی روانی میں محبت کے پھیلاؤ کا ایک دلکش منظر دکھائی دیتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ زمان و مکان کی ساری پہنائیاں محبت کے ایک لفظ کی گرفت میں ہیں۔ ایٹمی پھیلاؤ کے اس دور میں محبت کے پھیلاؤ کی جو اہمیت ہے کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

امجد ایک ان تھک انسان تھا۔ اپنی آخری سانس تک وہ اس ارشاد باری پر عمل پیرا رہا لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی اس کی کتابوں کی تعداد بھی اُتنی ہے جتنے اُس کی عمر کے سال تھے۔ اناسی سالہ امجد اُناسی کتابوں کا مصنف تھا۔

خواتین و حضرات! اس دنیا سے جانے والوں کے لیے رونا بھی بیکار اور روئے بغیر رہنا بھی ناممکن۔

مسلسل اب تو آنکھوں میں نمی محسوس ہوتی ہے
بڑی شدت سے امجد کی کمی محسوس ہوتی ہے

امجد کی وفات پر لکھے ہوئے دو قطعات:

ہمیں وہ دے گیا داغِ جدائی
زبانِ خلق دیتی ہے گواہی
وہ خوشبودار لفظوں کا لکھاری
وہ جنت کی طرف ہی تو گیا ہے

کرشمے تھے کئی اس کے ہنر کے
رہو چپ چاپ امجد کے سرہانے
ڈراما، شاعری، کالم نگاری
ابھی کچھ لکھتے لکھتے سو گیا ہے

(امجد کے بارے میں ایک تعزیتی اجلاس میں پڑھا گیا مضمون)

عامر بن علی/ جاپان

دستورِ زمانہ

ہنسنے والے اچھے ہیں
ہنسنے والوں کے ہمراہ
دنیا والے ہنستے ہیں
رونے والے تنہا ہیں
تنہا تنہا روتے ہیں
ناحق پیار کی دھرتی میں
اپنے آنسو بوتے ہیں
جو چاہو وہ کر لو تم
دنیا والے دوست تمہارے
تم کو اپنی جان سے پیارے
لیکن ایسا ہونا ہے
کل تم کو بھی رونا ہے
اور پھر تنہا ہونا ہے

✦✦✦

گمشدہ خوشبو

قریہ یار سے اس بار گزرنا اپنا
کتنا مشکل تھا
کروں کیسے بیاں
وہی مانوس ڈگر تھی
مگر اس بار وہاں
کوئی اپنا ہی نہیں تھا موجود
اور نہ منزل کا نشاں باقی تھا

✦✦✦

لبنیٰ صفدر/ لاہور

دل پہ جذبوں کا راج ہے صاحب
عشق اپنا مزاج ہے صاحب
دشت کی ریت ہے بہت پیاسی
آبلوں کا خراج ہے صاحب
پاس حرمت نہیں ہے لفظوں کی
کیسا وحشی سماج ہے صاحب
آپ کو بھول ہی نہیں پاتی
میرا کوئی علاج ہے صاحب
سانس بھی ٹھیک سے نہیں آتا
نفرتوں کا رواج ہے صاحب
کچھ بھی بدلا نہیں ہے دنیا میں
جو بھی کل تھا وہ آج ہے صاحب
میرا حصہ نہیں مقدر میں
یہ مرا احتجاج ہے صاحب

✦✦✦

کھڑکیوں سے لگی ہوئی آنکھیں
راستہ دیکھتی ہوئی آنکھیں
کہہ رہی ہیں کہانی اور ہی کچھ
خوف سے یہ بھری ہوئی آنکھیں
سرد خانے میں جیسے لاشیں ہوں
چہرے پر یوں مری ہوئی آنکھیں
کھل کے روتی ہیں جب بھی روتی ہیں
فیصلوں سے بندھی ہوئی آنکھیں
دشت میں اک الاؤ جلتا ہوا
گرد اس کے بجھی ہوئی آنکھیں
اور کتنی دراڑیں ڈالیں گی
آئنوں پر جمی ہوئی آنکھیں
چہرہ ادھڑا ہوا مرا لگتی
اور آنکھیں سلی ہوئی آنکھیں

زیرلب کچھ بیان بولتے ہیں: بسمل صابری کی شاعری

ڈاکٹر سعادت سعید/

خیالی باتیں یادہمی اور کابوسی باتیں جس شاعر کو مرغوب نہ ہوں تو پھر اس کے بارے میں یہ کہنا بے سبب نہ ہوگا کہ وہ حقیقت کو دیکھنے کا قائل ہے۔ شاعر کی حقیقت بینی کا تعلق اگر اس کی حقیقی زندگی کے حقیقی تجربات سے ہے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ اس کے کلام میں زندگی کی عکاسی کا رویہ دستیاب ہے۔ اگر زندگی کی عکاسی کسی شاعر کے دل کی صدا بھی بن جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ شاعر اپنے سچے تجربات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر رہا ہے۔ بسمل صابری کا کہنا ہے:

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

....

مجھ کو بسمل نہیں مرغوب خیالی باتیں
میرا ہر شعر مرے دل کی صدا ہوتا ہے

علاوہ ازیں وہ شاعر جنہوں نے زندگی کے شور زاروں میں خامشی کی پگھلتی آوازوں کو دیکھا، سنا اور محسوس کیا ہے تو وہ ملمع کار شوروں کی تہہ میں چھپے حقائق کو سامنے لانے پر قادر ہوتے ہیں۔ بقول بسمل صابری:

خامشی بھی مری بغاوت ہے
زیرلب کچھ بیان بولتے ہیں
میں تو چپ رہ کے بھی ہنر بانٹوں
میرے اندر جہان بولتے ہیں

ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو:

جینا پڑا ہے وقت کی رفتار دیکھ کر
بیٹھے کہیں نہ سایۂ اشجار دیکھ کر
تم نے تو غم کو اور بھی سر پر چڑھا دیا
ہم تو ملے فقط تمہیں غم خوار دیکھ کر
شاید یہ گھر ہے دیکھ ذرا اے خیالِ دوست
کیا یاد آ گیا در و دیوار دیکھ کر؟
کیا پھول سی ہنسی پہ گمانِ حیات تھا؟
خنداں ہے وقت مجھ کو سرِ دار دیکھ کر
ہم پھر سے آ گئے اسی کچے مکان میں
اونچے گھروں میں دشت کے آثار دیکھ کر
کتنی کٹھن ہے راہِ وفا تو بھی چل کے دیکھ؟
بسمل بھٹک نہ جانا کہیں پیار دیکھ کر

بسمل صابری معاصر اُردو غزل کی مقبول شاعرات میں اپنے منفرد لب ولہجہ کی بدولت اہم مقام کی حامل ہیں۔ ان کی شاعری پر ان کے بعض سینئر اور جونیئر شعرا نے خلوصِ دل سے اظہارِ خیال کیا ہے۔ اس اظہار خیال نے ان کے شعری مجموعوں ''پانی کا گھر''، ''یادوں کی بارش'' اور ''روشنیوں کے رنگ'' اور ''رس کی پھوہار'' کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ علی سردار جعفری کا خیال ہے:

''بسمل صابری کی شاعری کو میں نے ہمیشہ لحنِ داؤدی سمجھا۔ میں نے آپ کا کلام سنا تو یہ خیال یقین میں بدل گیا۔ اب جب آسمانی الہام کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں تو آپ کی آواز شاعری جزو یست پیغمبری بن کر اُبھرتی ہے۔ یہ آواز نور کی کرن ہے جو سخت اندھیرے کو چیر کر نکل جاتی ہے اور روشنی کی بشارت بن کر انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔''

تو ایسے میں مَیں اس رائے میں مزید کیا اضافہ کر سکتا ہوں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ بسمل صابری نے شاعری کو اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کا بنیادی وسیلہ سمجھا ہے۔ ان کے اندر موجود حساس شاعرہ رومان اور حقیقت کے امتزاج سے شعر سازی کرنے میں ہمہ وقت چوکس رہتی ہے۔ ان کے ترنم کی تعریف اپنی جگہ لیکن ان کے اندر موجود مزاحمتی رویہ سماج میں انسان کو اس کے اصل مقام کی یاد دلاتا ہے۔ اندھیرے کو چیر کر روشنی کی بشارت بننا ہی وہ مزاحمتی شعری رویہ ہے جس کی ضرورت بنی نوع انسان کو اس کے مختلف ادوار میں رہی ہے۔ یعنی مولانا روم کے بقول رات شیخ چراغ لے کر شہر میں گھوم رہا تھا اور کہتا جاتا تھا کہ میں وحشی درندوں سے تنگ ہوں مجھے انسان کی آرزو ہے۔ یہ انسان کی آرزو انسانیت کی روشنی کی تلاش پر منتج ہوتی ہے کہ یہ روشنی وحشی انسانوں کے ضمیروں کے اندھیروں کے خلاف رو بہ عمل رہتی ہے۔ بسمل صابری کہتی ہیں:

پیام بر ہے وہی تو مری شب غم کا
وہ اک ستارہ جو چشم سحر میں رہتا ہے

انہیں اس ستارے کی تلاش ہے جو صبح کی آنکھ میں قیام کرتا ہے۔ اسی ستارے کی وجہ سے غموں اور دردوں اور مقدروں کی تاریک راتوں سے نجات ملنے کا امکان ہے۔ میر تقی میر نے آنسو اور اشکوں کے حوالوں سے رنگا رنگ شعر کہے ہیں۔ ان کی چشم تر انہیں لہو بھی رُلاتی ہے۔ اگر کسی شاعری کا درد نصیب ہو جائے تو وہ کسی الم نصیب کی طرح سے زندگی کی پرکھ کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ درد و غم جمع کرنے والے افراد جب شاعری کے میدان میں اُترتے ہیں تو وہ موثر شاعری کر گزرتے ہیں۔

ایسے شاعر در و دیوار کی قید میں رہنے کی بجائے

دشت، صحرا اور کھلی ہواؤں کے سنگ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

کھلی فضا کا پیامی، ہوا کا باسی ہے
کہاں وہ حلقۂ دیوار و در میں رہتا ہے

وہ اپنے محبوب اور منتخب منزل کو اپنے ویژن کا حصہ بنانے میں عافیت محسوس کرتا ہے۔ اس لیے وہ اسے گنگنانے اور بیاضِ نظر میں رکھنے کا اہتمام کرتا ہے۔ بسمل صابری نے بھی اپنے شعروں میں اپنی منتخب کردہ منزل کو ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔ ان کے خیال میں انسان کو اپنی منزل اور اپنے وقت کی خود نشاندہی کرنا ہے ورنہ وہ وقت جو گزرنے اور شام وسحر کا تعاقب کرنے کا عادی ہے وہ کسی کی راہنمائی کیا کر سکتا ہے۔ وہ کسی کا غمگسار نہیں ہو سکتا۔ شاعر کی بے قراری اور تلاش کے عمل کو بسمل صابری نے بگولے کی صورت میں گرداں پایا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

گزرتا وقت مرا غم گسار کیا ہوگا
یہ خود تعاقبِ شام وسحر میں رہتا ہے
مرا ہی روپ ہے تو غور سے اگر دیکھے
بگولہ سا جو تری رہگذر میں رہتا ہے

صوفی کہتا ہے کہ ہمیں جس کی تلاش ہے وہ نہیں ملتا۔ اسے جواب ملتا ہے کہ جو نہیں ملتا مجھے اسی کی تلاش ہے۔ انسان کی بنیادی تلاش جہاں اپنی شناخت کے مسئلے سے متعلق ہے وہاں ایک ان جانی ہستی بھی ہے کہ جس کی تلاش اب بھی جاری ہے۔ اس حوالے سے بسمل صابری کہتی ہیں:

نہ جانے کون ہے جس کی تلاش میں بسمل
ہر ایک سانس مرا اب سفر میں رہتا ہے

اگر کوئی پانے کی کوشش کرے گا تو اس کا محبوب نظر اور منزل انتخاب اسے مل سکتے ہیں۔

بسمل صابری ایسی شاعرہ ہیں کہ جو اپنی زندگی کی گھڑیوں کو رائیگاں گنوانے کی قائل نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ انسان جب تک زندہ ہے اسے مختلف قسم کے دائرے، حصار اور کیفیتیں گھیرے رکھتی ہیں۔ ایسے میں نشاط وغم، فراق وسال، وفا و بے وفائی، دوستی اور دشمنی، حسد اور رشک، ہوس اور عشق صبر اور بے صبری، قناعت اور طمع، احتیاط اور عدم احتیاط سب کے سب انسان کے شب وروز کو اپنے گھیرے میں لیے رکھتے ہیں۔ انسان نے ان کے درمیان رہتے ہوئے درِ سر منزل کا سراغ لگانا ہوتا ہے۔ بسمل صابری لکھتی ہیں:

سحر ہوئی تو خیالوں نے مجھ کو گھیر لیا
جب آئی شب ترے خوابوں نے مجھ کو گھیر لیا
مرے لبوں پہ ابھی نام تھا بہاروں کا
ہجوم شوق میں خاروں نے مجھ کو گھیر لیا
کبھی جنوں کے زمانے کبھی فراق رتیں
کہاں کہاں تری یادوں نے مجھ کو گھیر لیا
نکل کے آ تو گئی گہرے پانیوں سے مگر
کئی طرح کے سرابوں نے مجھ کو گھیر لیا
یہ جی میں تھا کہ نکل جاؤں تجھ سے دور کہیں
کہ تیرے دھیان کی بانہوں نے مجھ کو گھیر لیا
جب آیا عید کا دن گھر میں بے بسی کی طرح
تو میرے پھول سے بچوں نے مجھ کو گھیر لیا
ہجوم رنج سے کیسے نکل سکے بسمل
تری تلاش کے رشتوں نے مجھ کو گھیر لیا

ڈاکٹر انور سدید کا بسمل شاعری کے بارے میں یہ خیال ان کی شاعرانہ اپج کا منہ بولتا ثبوت ہے:

''بسمل صابری نے اپنی راحتوں کی کلیاں شاعری میں پیش کرنے کا سلسلہ طویل عرصے سے شروع کر رکھا ہے اور وہ ان کلیوں کی خوشبو اپنے تک محدود نہیں رکھتیں بلکہ مشاعروں میں عوام میں بے دریغ تقسیم بھی کرتی ہیں اور پھر کتاب کی صورت میں اس خوشبو کو دوام ابد بھی عطا کرتی ہیں۔''

بسمل صابری کی کتابوں نے ان کے خیالات کی کلیوں کی خوشبو جابجا بکھیر رکھی ہے۔ یہاں غالب کی زمین میں لکھی گئی بسمل صابری کی غزل کا حوالہ میرے معروضات کی تصدیق کے لیے کافی ہوگا۔ اس غزل کا مطلع ہے:

حیراں ہوں کہ اب لاؤں کہاں سے میں زباں اور
لب کہتے ہیں کچھ اور انہیں ہوتا ہے گماں اور

اس کا مقطع ہے:

معراج تکلم ہے خموشی مری بسمل
آتی ہی نہیں کوئی مجھے طرزِ فغاں اور

شاعری جب خموشی کی زبان میں باتیں کرنے لگے تو پھر وہ اپنی خوں گشتہ آرزوؤں کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ شاعروں کو اس بات کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے کہ زمانے میں محبت کرنے والے کم کم ہی دستیاب ہوتے ہیں۔ اس کی وجہیں خود غرضی، ہوس اور کاروباریت کے رویوں میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ ایسے میں بسمل صابری محبت اور مروت کے کم یاب ہونے کی ایک جہت کی نشاندہی یوں کرتی ہیں:

جائیں تو کہاں جائیں محبت کے خریدار
اربابِ سیاست نے تو کھولی ہے دکاں اور

اور انہیں معلوم ہے کہ محبت دکانوں سے خریدی نہیں جا سکتی۔ ان کی سماج فہمی اس بات کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے کہ جتنا جبر روا رکھا جائے گا اتنی ہی مزاحمت اور بڑھے گی۔

معلوم نہیں ہے مرے صیاد کو شاید
گھٹتی ہے اگر سانس تو کھلتی ہے زباں اور

بسمل صابری کو بھی ایفائے عہد نہ کرنے والے انسانوں سے شکوے اور گلے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان کو اپنے کہے ہوئے لفظوں کا پاس ضرور کرنا چاہیے ورنہ ایک وقت آتا ہے جب اعتبار بالائے طاق رکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ اب وعدۂ فردا میں کوئی کشش نہیں ہے کہ دہرائی ہوئی باتیں گراں گزرنے لگتی ہیں۔

بسمل صابری کا خیال ہے کہ وہ آنکھ جو بھیدوں اور رازوں کو جانتی ہے اور جو وفا کی قیمتی سمجھتی ہے وہ دنیا کی رہنمائی کر سکتی ہے۔ اس آنکھ کے وسیلے سے حقیقت تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے

دیکھے گی جو اک پل میں مری آنکھ سے تجھ کو
ہو جائے گی دنیا تری جانب نگراں اور

رومان اور حقیقت کے امتزاج سے غزل میں تغزل کی جو کیفیات پیدا ہوتی ہیں بسمل صابری ان سے بھی بخوبی واقف ہیں۔ وہ کہتی ہیں:

لگ جاتی ہیں مہریں سی لبوں پر انہیں مل کر
ہوتا ہے مگر دل کے دھڑکنے کا سماں اور

....

ستم شعار کے ہاں زندگی گزار آئے
پھر اس کے بعد یہ کس امتحاں میں آ بیٹھے

انسان کی زندگی میں جو کوہ گراں آتے ہیں جن کی طرف میر اور غالب اور اقبال نے بھی یوں ارشاد کیے ہیں:

سب پہ جس بار نے گرانی کی
اس کو یہ ناتواں اُٹھا لایا
عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب کسی ناتواں سے اُٹھتا ہے

میر تقی میر:

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

غالب:

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

اقبال اور بسمل صابری کہتی ہیں:

کھلتی ہیں نہیں حشر کے دن بھی مری آنکھیں
شاید کہ مقدر میں ہے اک خواب گراں اور

شبیر ناقد اپنے مضمون شاعرات ارض پاک میں رقم طراز ہیں:

''روایت و جدت کا حسیں امتزاج ایک عمدہ اور معیاری شاعری کو جنم دیتا ہے۔ آوازوں کے اس ہجوم میں بہت کم شعراء اور شاعرات اس نوع کی پہچان رکھتے ہیں۔ شاعرات کی کھیپ میں بہت کم شاعرات ہیں جو نمایاں طور پر سامنے آئے ہیں ان میں سے بسمل صابری کا نامِ نامی بھی خاص اہمیت رکھتا ہے جن کا شعری سفر نصف صدی پر محیط ہے۔ وہ دنیائے اردو میں اپنی ایک شعری پہچان رکھتی ہیں اور پاک بھارت کی ہر دل عزیز شاعرہ ہیں ہم نے جب ان کے شعری مجموعہ ''پانی کا گھر'' اور ''روشنیوں کے رنگ'' کا مطالعہ کیا تو ہمیں ان کے شعری مزاج میں روایت اور جدت کا حسیں امتزاج نظر آیا۔''

میں نے ساہیوال، لاہور، سیالکوٹ، انبالہ اور بہت سے دوسرے علاقوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں ان کی مترنم آؤ بھگت ہوتی دیکھی ہے لیکن مشاعروں کی داد سے کوئی فرد اگر یہ نتیجہ نکالے کہ وہ واقعی کسی شاعر کو دریافت کر چکا ہے تو اسے کارِ عبث ہی قرار دینا چاہیے۔ تاہم جب مجھے بسمل صابری کی شاعری کو ان کے شعری مجموعوں کی وساطت سے پڑھنے کا موقع ملا تو میں نے دریافت کیا کہ وہ دردمند دل رکھنے والی ایک عمدہ شاعرہ ہیں۔ ان کے کلام میں ذات، سماج اور عالم کے حوالے سے رنگا رنگ اظہاریوں کا اہتمام ہوا ہے۔ اگر کوئی شاعری اپنی ذات سے سماج اور سماج سے عالم کی جانب سفر کرتا ہے تو جان لینا چاہیے کہ اس کے پاس ایسی وزڈم یا تعقل ہے کہ جو اسے ذات فہمی، سماج فہمی اور عالم فہمی کی راہوں پر محوِ سفر رکھے ہوئے ہے۔ بسمل صابری کے ان اشعار میں روایت اور جدت اور خموشی اور شور کی زبان کا امتزاج ملاحظہ ہو:

کبھی کھلا نہ بھرم تیری بے وفائی کا
جفا کرے بھی تو دعویٰ ہے پارسائی کا

....

ایک ہی اشک نہ پلکوں پہ سجایا جائے
سب کو مفہومِ غمِ زیست بتایا جائے

....

بارہا اُس کی جفائیں راحتِ جاں ہو گئیں
وادیاں تو خواہشوں کی پھر گلستاں ہو گئیں

....

پائی ہے کب کسی نے یہاں منزلِ مراد
میری کہانی مفت میں بدنام ہو گئی

....

لو بیبیاں بھی دھماکوں کی زد سے بچ نہ سکیں
چھپے ہیں درد دواؤں میں دیکھ لو آ کر

....

سوچو ذرا وہ زیست کو کیسے بسر کریں
جو لوگ آج بھوک سے اتنے نڈھال ہیں

....

شام ہوتے ہی جلا دیتے ہیں راہوں میں چراغ
مثلِ مہتاب وہ کب آئے گا ظلمات کے بعد؟

....

یوں مہکتا ہے مرے دل میں تصور تیرا
باغ میں جیسے کوئی پھول کھلا ہوتا ہے

....

محبتوں کے مسائل سلجھ تو سکتے ہیں
فضا نہیں ہے زمانے کی سازگار ابھی

❁❁❁

پاکستانی زبانوں کے مابین لسانی اشتراک: تخلیقی اور ثقافتی امکانات

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

میں شعبہ اردو کے صدر پروفیسر ممتاز کلیانی کا ممنون ہوں ،جنھوں نے مجھے اس کانفرنس کے افتتاحی اجلاس میں کلیدی گفتگو کی دعوت دی۔ یہاں ملک کے مختلف حصوں سے تشریف لائے ممتاز اہل قلم اور دانشور موجود ہیں۔ ان سب کی موجودگی میں پاکستانی زبانوں کے اشتراکات پر کچھ کہنا آسان نہیں ہے۔ وہ علم اور مرتبے میں مجھ سے کہیں بڑے ہیں۔ میں چند باتیں عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

زکریا یونیورسٹی کا شعبہ اردو اپنے ترقی پسندانہ مزاج کے سبب، ملک بھر کی جامعات میں خصوصی پہچان اور امتیاز رکھتا ہے۔ پاکستانی زبانوں کے مابین لسانی اشتراکات کے موضوع کا انتخاب بھی اس شعبے کے اسی مزاج کا مظہر ہے۔ پاکستانی جامعات کے اردو کے شعبے ایک طرح کی خود بینی وخود پسندی میں مبتلا ہیں؛ وہ اردو کی کلاسیکی دنیا سے باہر بہت کم دیکھتے ہیں۔ ان کی تدریس وتحقیق کا رخ کلاسیکی زبانوں یعنی عربی وفارسی کی طرف یا پھر جدید انگریزی کی طرف تو مسلسل رہتا ہے مگر پاکستانی زبانوں اور ان کے ادب کے سلسلے میں ان شعبوں کا دل کافر یعنی سخت کٹھور ثابت ہوا ہے۔ ایسے میں زکریا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کی طرف سے پاکستانی زبانوں کے باہمی روابط پر منعقد ہونے والی یہ قومی کانفرنس بے حد اہمیت کی حامل ہے۔

ہماری مقتدرہ کو فرق، فرقہ اور تفرقہ عزیز ہے، جب کہ عوامی دانش کا رخ اشتراک، مماثلت اور محبت کی طرف رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں دانشورانہ اظہار کا مطلب ہی، مقتدرہ پر راست سوال اٹھانا ہے۔ فرق وفرقہ کی منطق، استعماری عہد میں متعارف کروائی گئی۔ ایک ہی خطے میں صدیوں ،قرنوں سے رہنے والوں کے مابین پہلے فرق ڈھونڈا، فرق نہ ملا تو اسے پیدا کیا، پھر اسے بڑھایا۔ اس کا ذکر بار بار کیا۔ تاریخ سے اس کی مثالیں ڈھونڈیں پھر اسے باقاعدہ نظریے کی شکل دی۔ بعد ازاں نظریے کو مقدس بنا دیا۔ نظریہ مقدس ہو جائے تو وہ تشکیک اور سوال کی دنیا سے باہر ہو جاتا ہے۔ اسے انسانوں کی جان ، مال ، آبرو سب پر حاکمانہ اقتدار حاصل ہو جاتا ہے۔ مقدس نظریوں کے دل ، آدمیت کی حرمت سے یکسر خالی ہوتے ہیں۔ ان نظریوں کے پاؤں ، ایک الوہی تال کا شائبہ پیدا کر کے، لاکھوں انسانوں کو روندتے چلے جاتے ہیں۔

استعماری عہد سے موجودہ ساختی اور ڈیجیٹل استعماریت کے عہد تک، اس خطے نے بہت زخم سہے ہیں اور سب سے زیادہ زخم، زبان، مذہب، مسلک، قوم اور تاریخ کے تفرقہ نما تعبیرات کے ہاتھوں لگے ہیں۔ ہم نے بہت کم اس حقیقت کو سمجھا ہے کہ فرق وفرقہ کی منطق ، ظاہر میں شناخت دیتی ہے ، اصل میں شدت پسندی پیدا کرتی ہے۔ جب کوئی گروہ خود کو دوسرے گروہ سے فرق کی بنیاد پر شناخت کرتا ہے تو وہ پہلے ہی لمحے سے اپنی محبت اور دوسرے کی نفرت میں مبتلا ہوتا ہے۔ یہ گروہ اپنی زبان، اپنی تاریخ، اپنی نسل، اپنی قوم، اپنے کلچر سے جس قدر والہانہ عشق رکھتا ہے، اسی قدر وہ نفرت کے ہلاکت خیز جذبات خود سے مختلف زبان، مذہب وتاریخ کی حامل قوم کے لیے پیدا کر لیتا ہے۔ محض فرق کی بنیاد پر قائم ہونے والی ہر شناخت، دوسرے کے مسلسل انکار اور نفی کو مقصد اولیٰ بنا لیا کرتی ہے۔ ہمارے تصور قوم میں ہندو، دوسرے یعنی غیر کے طور پر شامل ہوا۔ ہم نے اپنی قومی زبان اردو کو مذہبی تقدیس کا حامل سمجھا، اور ہر ہندووانہ عنصر اور نشانی کی نفی کو اپنا مقدس فرض سمجھا ہوا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارے اکثر دانشوروں کی سب سے بڑی جدوجہد، اردو زبان اور اس کے ادب میں سے کافرانہ عناصر کی بیخ کنی رہی ہے۔ ہمارے لیے زبان کی ترقی کا مطلب تطہیر ہے۔ اس میں سے تمام کافرانہ نشانیاں خارج کرتے جائیں۔ کافر بھی مقامی اور ہمسایہ۔ یورپی کفار ہوں یا پارسی کفار، لسانی سطح پر ان کا سب کچھ قبول ہے۔ ہم نے اپنی قومی زبان کو تطہیر اور اخراج کی سیاست کے لیے جی بھر کے استعمال کیا ہے۔ اس سیاست کا نشانہ پاکستان کی زبانیں بھی بنی ہیں۔ چند مستثنیات ضرور ہیں، جنھوں نے پاکستانی زبانوں کے صوفی شعرا کو پاکستانی اردو کے تصور میں سمونے کی کوشش کی۔

یہ خیال کہ ”جو اپنی زبان سے محبت کرتا ہے، وہ دوسروں کی زبان سے بھی محبت کرتا ہے“ صرف اس وقت درست ہوسکتا ہے، جب آپ نے فرق و فرقے کی منطق سے آزادی حاصل کر لی ہو۔ اس منطق سے آزادی کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ آپ چیزوں کے مابین اشتراکات کی جستجو کریں، اور ان اشتراکات کی بنیاد پر گفتگو اور مکالمے کی بنیاد رکھیں۔ بلاشبہ چیزوں میں فرق بھی ہیں اور اشتراکات بھی۔ ہم انسانوں میں تعاون اور جارحیت دونوں جبلتیں ہیں۔ ہم تمام امتیازات کے باوجود ایک دوسرے سے تعاون بھی کر سکتے ہیں اور انھی امتیازات کو بنیاد بنا کر جنگ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ ہماری شخصی انا، علمی اور سیاسی مقتدرہ ہے جو فیصلے کرتی

ہے کہ وہ تعاون واشتراک کی جبلت کو راستہ دے گی یا تفرقے وجارحیت کی جبلت کو بے لگام رکھے گی۔

ہر زبان اپنی مخصوص انفرادیت بھی رکھتی ہے اور دوسری زبانوں سے مماثلتیں بھی۔ ہر زبان اپنا مخصوص صوتی ،نحوی ،معنیاتی نظام رکھتی ہے۔اس میں عوامی ادب ،تحریری ادب اور مقبول عام ادب کی اپنی مخصوص روایت ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوم کی سیاسی تاریخ سے لے کر، اس کی سماجی ،ثقافتی اور جمالیاتی اقدار کا مظہر ہوتی ہے۔ وہ ایک مخصوص تصورِ دنیا کی حامل بھی ہوتی ہے۔ ہر زبان کا اپنا ایک الگ جہان ہے جو صدیوں کے طویل وپیچیدہ عمل سے کہیں وجود میں آتا ہے، اسی لیے ایک زبان کا مرنا، گویا ایک جہان کی موت ہے۔ اپنی زبان کے مخصوص جہان پر فخر کرنے میں کوئی حرج نہیں، مگر اس فخر کا پیرایہ ایسا ہو کہ دوسری زبانوں کے جہانوں کے احترام کو مجروح نہ کرے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب زبانوں کی مماثلتوں پر توجہ زیادہ ہو۔ وہ سب قومی ریاستیں جو ’ایک زبان ،ایک مذہب، ایک قوم‘ کے اصول پر وجود میں آئی ہوں، اور وہ کثیر لسانی بھی ہوں ، ایک غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہوتی ہیں۔ وہ کثیر زبانوں کے لیے ،شاہ بلوط کے درخت کی یورپی تمثیل سے کام لیتی ہیں۔ شاہ بلوط کا درخت اوپر کی جانب اٹھتے موٹے تنے اور کثیر مگر چھوٹی شاخوں کا مسلسل ،مختلف سمتوں میں بڑھتا ہوا سلسلہ ہے۔اس تمثیل میں ساری اہمیت ایک بنیادی زبان کو حاصل ہوتی ہے، جو شاہ بلوط کے مضبوط تنے کی مانند ہے،اس کی شاخوں کو ذیلی وضمنی حیثیت دی جاتی ہے۔ ہماری زبانوں کے لیے درختوں میں سے اگر کسی درخت کی تمثیل ہو سکتی تھی تو وہ برگد کا درخت ہے۔ برگد اوپر، نیچے، دائیں بائیں سب اطراف میں بہ یک وقت بڑھتا ہے۔جس طرح ہمارے مذہب میں مثالی طور پر کسی عجمی کو عربی پر، گورے کو کالے پر فوقیت نہیں، اسی طرح برگد کی تمثیل میں کسی ایک زبان کو کسی دوسری زبان پر کوئی فوقیت نہیں۔

اگر آپ زبانوں کے تنوع اور کثرت کے باوجود، ان میں اشتراک کے خواہاں ہیں تو جہاں زبانوں میں صریح اور واضح مماثلتیں نہ ہوں وہاں بھی اشتراک کے امکانات دریافت کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً پاکستان کی پچہتر سے زائد زبانیں ہند آریائی، ہند ایرانی ،دراوڑی ، چینی تبتی خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک لسانی خاندان کی زبانوں میں صوتی ونحوی ومعنیاتی اشتراکات زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسی زبانوں میں لفظی لین دین آسان بھی ہوتا ہے اور اس کا رواج بھی جلد ہو جاتا ہے۔ تاہم ہر زبان ، کسی بھی دوسری زبان کے الفاظ کو قبول کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ کبھی لفظ کو اس کی اصلی صورت میں، کبھی اسے بدل کے اور کبھی بگاڑ کے۔ انگریزی خود کو واحد عالمی زبان بنانے کا پختہ عزم رکھتی ہے، اس لیے وہ ہر سال اپنی لغت میں ان سب زبانوں کے الفاظ شامل کرتی جاتی ہے، جہاں جہاں یہ بولی جاتی ہے۔ ایک ہے زبان کی اپنی اہلیت اور ایک ہے، زبان سے متعلق اور زبان کے ذریعے سیاست۔ ہم نے اپنی زبانوں کی لسانی اہلیتوں کو کم ہی ظاہر ہونے کا موقع دیا ہے، ان کے ذریعے سیاست زیادہ کی ہے۔ ہم نے اپنی زبانوں کے مابین اشتراکات کے امکانات کی جستجو کم سے کم کی ہے۔ انیس سو ساٹھ کی دہائی میں پاکستانی زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا خیال ضرور آیا تھا۔ اس کے لیے اردو سائنس بورڈ اور دوسرے اداروں نے پاکستانی زبانوں کے لغات ،اردو میں شایع کرنے شروع کیے تھے۔ نیز ہفت زبانی لغت بھی شایع ہوا تھا۔ یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔

سب سے بڑی کمی پاکستان میں زبانوں سے متعلق کسی مرکزی ادارے کا نہ ہونا ہے۔ پاکستان میں خود پاکستانی زبانوں پر باقاعدہ تحقیق کے لیے سرے سے کوئی ادارہ ہی موجود نہیں ہے اور ایسے ادارے کے موجود نہ ہونے کا کسی کو تاسف بھی نہیں ہے۔ یہ کہ دنیا کی سات ہزار ایک سو اکہتر زبانوں میں سے چھہتر پاکستانی زبانیں ہیں، جن میں اکہتر مقامی اور نو بیرونی زبانیں ہیں، دنیا کی تمام زبانیں ایک سو چھپن خاندانوں سے تعلق رکھتی ہیں اور سب سے بڑا خاندان ہند یورپی ہے۔ پاکستان کی ساڑھے بائیس کروڑ کی آبادی میں قریب ڈھائی لاکھ ساعت سے محروم ہیں، یعنی کوئی زبان نہیں بول سکتے۔ پاکستان کی چھہتر زبانوں میں صرف چار ادارہ جاتی سطح پر مستحکم ہیں، یعنی انھیں حکومتی ادارے ، میڈیا استعمال کرتے ہیں اور چوبیس ترقی پذیر حالت میں ہیں، یعنی انھیں گھروں میں بچوں کا باقاعدہ سکھایا جاتا ہے، تیس اچھی حالت میں ہیں ،سولہ مشکل کا شکار ہیں اور چار مر رہی ہیں۔ یہ سب معلومات ہمیں ایک عالمی ادارے Ethnologue سے دستیاب ہوتی ہیں۔ اسی طرح پاکستانی جامعات میں لسانیات کے ایسے شعبے وجود نہیں رکھتے جو پاکستانی زبانوں کی تحقیق وتدریس کے لیے مختص ہوں۔ زبان سے متعلق اور پاکستانی زبانوں سے متعلق سارا کچا پکا علم، خود ہمارا پیدا کردہ نہیں ہے۔ بغیر مستند علم کے کوئی پالیسی یا لائحہ عمل کیسے بنایا جاسکتا ہے؟ مستند علم ہمیشہ مقامی ہوتا ہے۔ ہمارے پاس اپنی ہی زبانوں کا مستند علم نہیں ہے۔ اور یہی وہ نازک مقام ہے، جہاں سیاست کا وار کاری ہوتا ہے۔ جہاں جہالت وغفلت یکجا ہوں

وہاں کسی بھی نوع کی سیاست، کسی بھی نام سے کی جاسکتی ہے۔

زبانوں کے درمیان تخلیقی وثقافتی اشتراکات کو ممکن بنانے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ہم زبان کی واقعی اہمیت کو محسوس کریں۔ جولوگ زبان کو محض خیال، علم، رائے، جذبے کے اظہار کا آلہ سمجھتے ہیں، وہ زبان کی تخفیف کرتے ہیں؛ اسے محض ایک شے سمجھتے ہیں، جسے ضرورت کے تحت برتا جاتا ہے اور پھر ضائع کردیا جاتا ہے یا اس سے لاتعلقی اختیار کرلی جاتی ہے۔ جس طرح اس بات سے بہت فرق پڑتا ہے کہ آپ آدمی کی تعریف کیا کرتے ہیں؟ اسے دوسری مخلوقات سے اشرف اور ان پر غالب سمجھتے ہیں یا انھی کی مانند سیارہ زمین پر بسنے والی، ایک قدرے مختلف مخلوق، یا آدمی کو سوچنے والی مخلوق خیال کرتے ہیں یا صارفی ڈنگر، ان تعریفوں سے آدمی کے اس سارے تجربے پر بہت فرق پڑتا ہے جسے دنیا میں اس کے ہونے کا تجربہ کہا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس سے بہت فرق پڑتا ہے کہ آپ زبان کو صرف ایک آلہ ابلاغ خیال کرتے ہیں، جو آدمی سے الگ ہوتی ہے یا ایک ایسی چیز جو آدمی کے ڈی این اے کا حصہ ہے۔ جب آپ زبان کو ڈی این اے کا حصہ سمجھتے ہیں تو آپ زبان کی اصل اہمیت، قوت، اختیار کو محسوس کرتے ہیں۔ پھر آپ محسوس کرتے ہیں کہ دنیا میں سب سے بڑا اختیار، زبان کا ہے۔ آپ اگر اپنی زبان رکھتے ہیں، اس میں موجود ادب وثقافت کی روایت سے دلی رشتہ رکھتے ہیں تو کوئی جنگ نہیں ہار سکتے۔ سب سے بڑی ہار، اپنی ذات، اپنی تاریخ، اپنی ثقافت، اپنی اساطیر، اپنی شناخت اور اپنی یادداشت کی ہار ہے۔ بیرونی استعمار دیسی لوگوں کے لیے ایسی ہی ہار کا انتظام کرتا ہے۔ آپ اپنی زبان کے ہوتے ہوئے، اس عظیم شکست سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اپنی اجتماعی یادداشت اور اپنی کہانیوں کی بازیافت کرکے اور اپنے قصوں میں استعمار کے اصل تاریک چہرے کو سامنے لاکر، سیاسی میدان میں شکست کا بدلہ بھی لے سکتے ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ ہم نے زیادہ تر استعمار کو فرشتہ صورت نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا اور ایک نسل کی شکست کو اپنی قوم کی شکست بنا کر رکھ دیا۔ ایسے میں اس سرائیکی خطے کے رفعت عباس اور اشولال کا ذکر ضروری ہے، جنھوں نے ثقافتی یادداشت پر بیرونی یلغار کو محسوس کیا ہے اور اپنی مقامی اساطیر کی بازیافت کی ہے۔

بھاویں انھاں لکھ اساکوں مٹی کیتا ہووے
سرخیاں لاتے منہ رنگواتے باغ بنیدے ہیسے
ہک بیگانی جنگ دیاں بھرتیاں تھیندیاں پیاں ہِن رفعت
اساں اپنے پکھی پانی پیئے لکیندے ہاسے
اساں مسیتاں ملک عرب توں نسے آندیاں رفعت
اپنے چونے وچ بکھایا خانہ اپنے رب دا
فوجاں اپنیاں بیرکاں دوں اچ واپس ونجن رفعت
ساکوں اپنی جھمر کیتے جا لڑیندی پئی ہے

زبانوں کے مابین اشتراکات ممکن بنانے کا دوسرا طریقہ لوگوں کا زیادہ سے زیادہ میل جول ہے۔ اس ضمن میں انڈس کلچرل فورم کے مادری زبانوں کے سالانہ میلے کا ذکر ضروری ہے، جو ہر سال فروری میں پاکستانی زبانوں کے مصنفین کو اکٹھا کرتا ہے، اوران کے مابین مکالے کا اہتمام کرتا ہے۔ تیسرا طریقہ ترجمے کا ہے۔ اردو میں زیادہ تر تراجم یورپی، امریکی، لاطینی امریکی، افریقی اور کسی حد تک وسط ایشیائی اور جنوبی ایشیائی زبانوں سے ہورہے ہیں۔ پاکستانی زبانوں سے تراجم آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ پاکستانی زبانوں سے دوطرفہ تراجم زیادہ سے زیادہ ہونے چاہییں۔ محض ایک زبان سیکھ کر آپ اس زبان کے براعظم کے کنارے پر رہتے ہیں۔ یہ ادب اور فنون ہیں جو کسی زبان کے براعظم کے دل تک رسائی دیتے ہیں، اس لیے پاکستانی زبانوں سے دوطرفہ تراجم، ان زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کا مؤثر ذریعہ ہیں۔

آخری بات۔ ہماری لسانی وادبی تاریخ نویسی، اب تک یک رخی ہے۔ ہم ایک علاقے کی لسانی وادبی تاریخ لکھتے ہوئے، اس کی محض ایک زبان کو سامنے رکھتے ہیں، جب کہ اس علاقے میں ایک سے زیادہ زبانیں بولی جارہی ہوتی ہیں اور ان میں ادب لکھا جارہا ہوتا ہے۔ ایک ہی واقعے کو ایک ہی مقام پر، مختلف زبانیں بولنے والے کیسے تجربہ کرتے ہیں؟ ہم اس سوال کو اپنی تاریخ نویسی میں جگہ نہیں دیتے۔ مثلاً ہم یہ نہیں دیکھتے کہ قیام پاکستان کے فوری بعد پاکستانی ادب کا سوال اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوی، سرائیکی میں کس طور سامنے آیا یا کچھ زبانوں میں اس ضمن میں مکمل خاموشی ملتی ہے؟ زبانوں کو تخلیقی اور ثقافتی طور پر ایک دوسرے کے قریب لانے کے لیے اس یک رخی تاریخ نویسی کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔

(زکریا یونیورسٹی، ملتان کے شعبہ اردو کی کانفرنس ''پاکستانی زبانوں میں لسانی اشتراک'' منعقدہ ۶ مارچ، ۲۰۲۳ء، بہ طور کلیدی مقالہ پیش کیا گیا)

اقبال اور اصحابِ رسول ﷺ (سیدنا صدیق اکبرؓ)

ڈاکٹر تفاخر محمود گوندل

خلیفۃ الرسول ﷺ، مزاج شناسِ نبوت، تاج دارِ اقلیمِ صداقت سیدنا ابوبکر صدیق تاریخِ اسلام کی وہ ولولہ انگیز اور صاحبِ فراست و تدبّر ہستی ہیں جن کے نام کے ساتھ عشق و محبتِ مصطفیٰ ﷺ کی آبرو وابستہ ہے۔ نیابتِ رسولؐ کا مقدس فریضہ انجام دینے والی اس رفیع الشان ہستی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آپؓ کو آپؓ کے والدین اور اولاد کو دولتِ ایمان نصیب ہوئی۔ اپنے آقا و مولیٰ حضور سید المرسلین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ والا صفات کے ساتھ آپؓ کی وجدانی وابستگی، شیفتگی اور محبت کا عالم یہ تھا کہ جب حبیبِ کبریا کو معراج جیسا منفرد اعزاز بخشا گیا تو تقویم روزگار رک سا گیا تھا، زنجیر بھی ہلتی رہی اور بستر بھی رہا گرم کے مصداق حضورؐ نے افلاک سے واپس تشریف لا کر معاندینِ اسلام کے سامنے اپنے اس استعجاب آفرین سفر کا احوال بیان فرمایا تو وہ حسبِ روایت تمسخر واستہزا کا مظاہرہ کرنے لگے۔ مقامِ نبوت سے ناآشنا شرارِ بولہبی کو کیا خبر کہ چراغِ مصطفوی کبھی شمعِ کشتہ نہیں بن سکتی چناں چہ وہ آوارگانِ صحرائے عرب جب کوچہ ہائے بطحا میں آقاؐ کے سفرِ مقدس کا (العیاذ باللہ) مذاق اڑانے میں مصروف تھے کہ اچانک ان کا ازلی رفیقِ نبوت سے سامنا ہو گیا۔ کشتۂ شمعِ رسالت نے تمسخر کا یہ ڈھول پیٹنے کی وجہ پوچھی تو وہ منکرینِ توحید و رسالت بلند آہنگ سے بیک زبان کہنے لگے کہ تمھارا دوست (معاذ اللہ) آج ایک اور فلسفہ ایجاد کر لایا ہے (نقلِ کفر کفر نباشد) کہ میں راتوں رات افلاک کی سیر کر آیا ہوں اور وصالِ ربِ کائنات کی سعادت بھی حاصل کر آیا ہوں۔ سیدنا صدیقِ اکبرؓ کی رگِ حمیت و محبت پھڑکی۔ آپ نے پوچھا: کیا تم نے خود زبانِ محمد ﷺ سے یہ واقعہ سنا ہے؟ انھوں نے کہا: ہاں، وہی عالمِ بالا کی سیر کا احوال سنا رہے ہیں۔ ایمان و ایقانِ صدیق اکبرؓ کی رفعت و شوکت دیکھیے! فرمایا: اگر یہ اظہارِ حقیقت خود میرے آقا و مولیٰ ﷺ کی زبانِ گوہر فشاں سے ہوا ہے تو میں بلا تامل اس کی تصدیق کرتا ہوں، حضورؐ جو کچھ ارشاد فرما رہے ہیں وہ سچ ہے۔ اُسی دن سے آپؓ کا لقب صدیق پڑ گیا۔ دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ کی اس تصدیق سے کفارِ مکہ کی یہ تخریبی سوچ فنا کے گھاٹ اتر گئی کہ جب ابوبکرؓ حیرت انگیز واقعۂ معراج کے وقوع پذیر ہونے کی حقانیت سے انکار کریں گے تو ہمیں تالیاں پیٹ کر خندہ استہزا کا موقع مل جائے گا کہ محمدِ عربی ﷺ کے سب سے قریبی ساتھی اس واقعہ کی تصدیق کرنے سے گریزاں ہیں۔ قرآن نے بھی تصدیق کی جانب واضح اشارا کیا ہے کہ "تحقیق جو سچ لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی دونوں متقی ہیں"۔ پیکرِ خلوص و وفا سیدنا صدیقِ اکبرؓ وہ رفیقِ نبوت اور معتمدِ خاص تھے جنھیں اہلِ وجدان و محبت مزاج شناسِ نبوت کا نام بھی دیتے ہیں اس لیے کہ یہی وہ صاحبِ کمال ہستی ہے جو حضورِ ختمی مرتبت کے محض ایک اشارۂ ابرو سے ہی یہ اندازہ کر لیا کرتی تھی کہ آقائے گیتی پناہؐ اگلے ہی لمحے کیا ارشاد فرمانا چاہتے ہیں یا منشائے رسالت مآب کیا ہے۔

ع قربان یک نگاہ تو عمرِ درازِ ما

خاطرِ نبوت کو سمجھنے کی صلاحیت آپؓ میں کس حد تک قوی و مستحکم تھی کہ جب حجۃ الوداع کے موقع پر آپؐ نے یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العزت نے اپنے ایک بندے کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا میں رہنا پسند کرے یا پھر وہ وصالِ رب کا پیغام قبول کرے۔ یہ سن کر اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اپنے آقاؐ کی معیت میں بسر کرنے والے صدیقِ اکبرؓ کے گوشہائے چشم سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آپؓ فوری طور پر حضور سرورِ دو عالمؐ کے اس ارشادِ گرامی کو سمجھ گئے کہ اب آپؐ کے لمحۂ فراق کا وقت قریب آ گیا ہے چناں چہ وہ بارِ رنجِ فراق سے اشکبار ہو گئے۔ اسی طرح بوقتِ ہجرت جب سیدنا صدیقِ اکبرؓ نے بارگاہِ رسالت سے اجازت طلب کی تو آپؐ نے کنایۃً ارشاد فرمایا: جلدی نہ کرو شاید تمھیں کوئی بہتر رفیقِ سفر مل جائے تو مزاج شناسِ نبوت فوراً سمجھ گئے کہ انھیں اس سفر میں رفاقتِ محمدِ عربی ﷺ نصیب ہونے والی ہے۔ صدیقِ اکبرؓ کے قبولِ اسلام سے فدایانِ دینِ محمدِ عربی ﷺ کے حوصلوں کو نیا ولولہ اور ان کے عزائم کو تسخیر کے نئے افق عطا ہوئے جس سے تخیل و طائرِ دینِ مبین اوجِ ثریا کی جانب مائلِ پرواز نظر آنے لگا۔ تقدیسِ دامنِ نبوت سے وابستہ ہوتے ہی آپؓ نے اپنی تمام دولت و ثروت نعلینِ حبیبِ کبریاؐ پر نچھاور کر دی۔ جنگ ہو یا امن، شب کی تاریکی ہو یا صبح کا اُجالا، مصائب و آلام کی آندھیاں چل رہی ہوں یا رحمت کی گھٹائیں برس رہی ہوں غزوۂ تبوک ہو یا غزوۂ بدر، شبِ ہجرت ہو یا فتحِ مکہ، استبدادِ زمانہ کی قہرمانیاں ہوں یا فتحِ مبین کی شادمانیاں، رنج و کلفت ہو یا فرحت و انبساط فدایانِ نبوت کا انبوہِ کثیر ہو یا غارِ ثور کی تنہائیاں، سوز و گدازِ الیقین کا معاملہ ہو یا حرارتِ ایمانی کی آزمائش، کون سا ایسا موقع ہے جہاں رازدارِ نبوت، صدیقِ اکبرؓ نے اپنے جذبۂ ایقان کی قندیل روشن نہ کی ہو۔ فقرِ سوزِ صدیق تو وہ متاعِ گراں مایہ ہے جس سے تشنگانِ چشمۂ غنایت و معرفت تا ابد سیراب ہوتے رہیں گے۔ حضورؐ کی غلامی کا قلادہ

زیبِ گلو کرنے کے بعد صدیق اکبرؓ قندیلِ اسلام کی لو سے لوگوں کے دلوں کو جگمگانے لگے اور آپؓ اپنے بختِ بیدار پہ نازاں تھے کہ آپؓ کو بارگاہِ نبوت سے انتہائی قرب کی نویدِ جاں فزا سنائی گئی۔ حضورؐ نے خلوص و وفا کے اس پیکر کے بارے میں بے ساختہ ارشاد فرمایا کہ میں نے تمام لوگوں کے احسانات کا بدلہ اتار دیا ہے مگر ابوبکرؓ کے احسانات کا بدلہ اللہ رب العزت اتارے گا۔ آپؓ اپنے خاندان میں سب سے متمول شخص تھے اور قبولِ اسلام کے بعد آپؓ کی تمام دولت و ثروت اشاعتِ اسلام کے لیے صرف ہوئی۔ آپؓ نے کتنے ہی ستم رسیدہ مظلوم و مقہور اہلِ ایمان کو ان کے جابر و ظالم آقاؤں سے خرید کر آزاد کروایا۔ اُن میں جاں سپارِ مصطفیٰؐ حضرت بلال حبشیؓ بھی شامل تھے۔ ایک بار حضرت بلالؓ کا آقا اُمیہ آپ کو دہکتے انگاروں پر لٹا کر آپ پر تشدد کر رہا تھا کہ اُدھر سے سیدنا صدیق اکبرؓ کا گزر ہوا تو آپؓ نے دیکھا کہ ایک پیکرِ جبر و استبداد بلالؓ پر وحشت و بربریت کے پہاڑ توڑ رہا ہے۔ ایسی ناقابلِ بیان اذیت دیکھ کر آپؓ بے ساختہ اشک بار ہو گئے۔ آپؓ نے فوراً اس سیاہ فام غلام زادے کو خرید کر آزاد کرنے کا فیصلہ کر لیا جس کی رگ رگ میں محبتِ خدا و رسولؐ سمائی ہوئی تھی، جس کا بال بال وحدہٗ وحدہٗ پکار رہا تھا۔ آپؓ نے اُمیہ سے قیمت پوچھی۔ امیہ نے دانستہ ایسی قیمت بتائی کہ یہ خرید نہ سکے اور اسے مزید بلال پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے کا موقع مل جائے مگر آپؓ نے منہ مانگے دام دے کر اس رشکِ قمر بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔

اسی طرح سیدنا صدیق اکبرؓ کے دلائل و براہین اور ترغیب سے متاثر ہو کر سیدنا عثمان ذوالنورینؓ جیسی رفیع الشان ہستی مشرف بہ اسلام ہوئی جس کے نتیجے میں جیشِ اسلام کی مالی استعداد میں بے پناہ اضافہ ہوا اور مسلمان اپنے لشکر کو تیر و سناں سے مسلح کرنے میں کامیاب ہوئے۔ آپؓ پر توحیدِ ربانی اور عشقِ رسولؐ کا غلبہ اس قدر تھا کہ قبولِ اسلام کے آغاز پر ایک بار آپؓ آقائے دو جہاںؐ کی معیت میں بیت اللہ تشریف لائے۔ وہاں کچھ عرصہ محوِ عبادت رہنے کے بعد آپؓ کی رگِ شجاعت و عزیمت پھڑکی۔ آپؓ نے اچانک کھڑے ہو کر پوری استقامت سے اعلائے کلمۃ الحق کر دیا۔ وہاں اُس وقت قریشِ مکہ کے بڑے بڑے سورماؤں کی ایک کثیر تعداد بیٹھی توقیرِ جوارِ کعبۃ اللہ سے بے نیاز خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ انھوں نے جب سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی یہ جرأت رندانہ دیکھی تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ آپس میں دبی زبان میں ہم کلام ہوئے، کہنے لگے: ابی قحافہ کے بیٹے کی یہ جرأت! اگر آج اسے زبان بندی پر مجبور نہ کیا گیا تو اس صدائے حق کی تلاطم خیز موجیں ہماری کائناتِ دل و جاں اور روایتِ اصنام پرستی کو زیر و زبر کر دیں گی اور پھر یہ دلدوز تغیر کسی انقلاب کا پیش خیمہ نہ ثابت ہو؟ چناں چہ مقامِ نبوت سے ناآشنا وہ اوباش، پرستارِ توحید اور جاں سپارِ مصطفیٰؐ سیدنا صدیق اکبرؓ پر پوری قوت سے حملہ آور ہو گئے اور آپؓ کو اس شدت سے زد و کوب کیا کہ اس عاشقِ رسولؐ کا چہرہ متورم ہو گیا اور آپؓ غش کھا کر گر پڑے۔ جب آپؓ کے اہلِ خاندان کو قریش کے اس ظلمِ عظیم کا پتا چلا تو وہ انھیں بے ہوشی کے عالم میں اٹھا کر گھر لے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد جب آپؓ کی طبیعت سنبھلی تو والدہ نے پوچھا، کیسی طبیعت ہے؟ اُس فدائے حبیبِ کبریاؐ نے اپنا احوال بتانے کے بجائے پہلے سوال یہ کیا کہ میرے آقا و مولیٰ حضور سید المرسلینؐ کیسے ہیں۔ والدہ نے بیٹے کے ساتھ ایک فطری محبت کے پیشِ نظر استفسار کیا، پہلے ہوش میں تو آؤ! آپؓ نے بے تابی سے کروٹ بدلتے ہوئے فرمایا: اماں جان! میرے ہوش و حواس اور تاب و تواں سب وجودِ مسعودِ مصطفیٰ ﷺ کی خیرات ہیں۔ میری جان و مال آپؐ پر قربان جب تک اپنے محبوبؐ کے رُخِ پُر نور کا دیدار نہیں کر لوں گا اس وقت تک پانی کا ایک گھونٹ نہیں پیوں گا۔ آپ کے بے حد اصرار پر آپ کی والدہ نے خاموشی سے اُمِ جمیل کو بلایا اور کہا کہ میرا بیٹا اس کشمکشِ موت و حیات میں بھی رخِ محمد مصطفیٰ ﷺ کو دیکھنے کا مشتاق ہے۔ اُمِ جمیل نے جب سیدنا صدیق اکبرؓ کے متورم اور مجروح چہرے کی کیفیت دیکھی تو تڑپ اٹھیں اور اس غایتِ جذبۂ عشقِ رسولؐ پر اشکبار ہو گئیں۔ انھوں نے جنابِ ابوبکرؓ کو بتایا کہ وہ ابھی ابھی حضورؐ کی زیارت سے مشرف ہو کر آئی ہیں اور آپؐ اس وقت دارِ ارقم میں تشریف فرما ہیں۔ سیدنا صدیق اکبرؓ جو فراقِ رسول خداؐ میں ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے مسرت و انبساط سے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اُم الخیر سے عرض کیا: مجھے ابھی وہاں لے چلو، میں جب تک اپنے محبوبِ مکرم کا دیدار نہ کر لوں پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتاروں گا۔ آپؓ والدہ کے ساتھ لرزتے ہاتھوں، کپکپاتے قدموں کے ساتھ زخموں سے چُور آقائے گیتی پناہؐ کی بارگاہِ اقدس پناہ میں حاضر ہوئے۔ رحمۃ للعالمین ﷺ نے جب اپنے مخلص جاں نثار کی یہ کیفیت دیکھی تو حضورؐ کے گوشہائے چشم سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ابوبکر! تم نے والدہ کو ساتھ لانے کی زحمت کی، میں خود ہی چلا آتا۔ آپؓ نے عرض کیا: حضورؐ! آپ کے رنجِ فراق میں زندگی کا ایک ایک لمحہ گراں گزر رہا تھا۔ والدہ کو اس لیے ساتھ لایا ہوں کہ میری ماں جیسی شفیق و کریم ہستی ابھی تک دولتِ ایمان سے محروم ہے۔ ان پر چشمِ التفات فرمائیے! حضورؐ نے اپنے محبوب رفیق کی والدہ کو کلمہ پڑھوا کر حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔ آپؐ نے اپنے عاشقِ صادق کے ضرباتِ کفر سے مجروح چہرے پر اپنا دستِ کرم پھیرا چناں چہ حضور کی دل نواز مسیحائی

سے آپؐ کی ساری کلفت واذیت رفع ہوگئی۔ کفار کے اس بہیمانہ جبر واستبداد سے حضرت ابوبکرؓ کے پائے استقامت میں خفیف سی لغزش بھی آنے کے بجائے محبت خدا ورسول کی آگ تیز تر ہوگئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ فلسفۂ صدیقِ اکبرؓ اقبال کی نظر میں یہ تھا:

درونِ ما بجز دودِ نفس نیست
بجز دستِ تو ما را دسترس نیست
مگر افسانۂ غم با کہ گویم
کہ اندر سینہ ہا غیر از تو کس نیست

ترجمہ: میرے اندر سانس کے دھوئیں کے بغیر کچھ نہیں۔ تمھارے ہاتھ کے سوا ہماری رسائی کسی ہاتھ تک نہیں۔ پھر میں غم کا فسانہ کس سے کہوں کہ میرے سینے میں تمھارے سوا کوئی بسا ہوا نہیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ ساتھ ذریت صدیق اکبرؓ میں بھی حضور سید دو عالم ﷺ کے ساتھ محبت وشیفتگی جنون کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ جب رسول اللہؐ اپنے محبوب رفیق سفر کے ساتھ سفرِ ہجرت پر روانہ ہوئے تو طے شدہ منصوبے کے مطابق آپؐ راز دار ہم سفر کے ساتھ شمال کی جانب واقع سیدھے مدینہ طیبہ تشریف لے جانے کے بجائے بڑی حکمت کے ساتھ مکہ سے جنوب کی جانب غارِ ثور میں تشریف لے گئے۔ جب کفارِ مکہ کو حضورؐ کی ہجرت کا پتا چلا تو شہر میں ایک کہرام مچ گیا۔ شہر اور اس کے مضافات میں حضورؐ کے نقشِ کفِ پا کی تلاش شروع ہوگئی۔ چوں کہ کفار کو سیدنا صدیق اکبرؓ اور آپؐ کے آقا حضور سرورِ کائناتؐ کی انتہائے قربت ورفاقت کا پتا تھا اس لیے ابوجہل اس خدشے کی بنیاد پر کاشیانۂ صداقت پر پہنچا کہ کہیں حضورؐ اپنے رفیقِ خاص کے گھر چھپے ہوئے نہ ہوں۔ اس نے بڑی فرعونیت کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا۔ سیدنا ابوبکرؓ کی صاحبزادی حضرت اسماؓ نے دروازہ کھولا۔ ابوجہل نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا: یہاں محمدؐ ہیں؟ تربیت یافتۂ آغوشِ صداقت حضرت اسماؓ نے جسارت آمیز انداز میں فرمایا: مجھے نہیں معلوم۔ قرینہ ہائے احترامِ عالمِ نسوانیت سے ناآشنا بدبختِ ازلی ابوجہل نے بنتِ صدیقِ اکبرؓ کے چہرے پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا جس سے حضور ﷺ کی اس فداکارہ کی کانوں کی بالی دور جاگری۔ عالمِ کفر کا یہ جور و استبداد خاندانِ صدیقِ اکبرؓ کے افراد کا ایمان پختہ تر کرتا چلا گیا۔ توحید ورسالت پر فدا ہوجانے کا جذبہ دن بدن فزوں تر ہوتا چلا گیا۔ قیامِ غارِ ثور کے دوران کفارِ مکہ کے مذموم ارادوں سے حضورؐ کو مطلع کرتے رہنے کی ذمے داری جناب ابوبکرؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہؓ کی تھی اور کام و دہن کا اہتمام دونوں ہمشیرگان حضرت عائشہؓ اور حضرت اسماؓ کے ذمے تھا جسے انھوں نے بطریق احسن انجام دیا۔ اس اثنا میں اس خاندان کی حضورؐ پر جاں نثاری کا ایک اور ایمان افروز اور ولولہ انگیز واقعہ بھی پیش آیا جس سے بناتِ صدیقِ اکبرؓ کے خلوص، ایثار، محبت وعشقِ رسول کا پتا چلتا ہے۔ بوقتِ ہجرت، حضورؐ کے وہ رفیق جن سے بنائے عشق ومحبت اُستوار ہے، گھر کا تمام اثاثہ (زر و مال) ساتھ لے گئے، نجانے اس صبر آزما سفر میں آقائے دوجہاں کو کیا کیا ضرورت پیش آسکتی ہے۔ دوسرے روز حضرت صدیق اکبرؓ کے والد ابی قحافہ جو ابھی تک اسلام وایمان کی دولت سے بہرہ یاب نہیں ہوسکے تھے، نے صاحبزادیوں سے کچھ رقم طلب کی۔ چوں کہ ساری رقم سیدنا صدیقِ اکبرؓ ساتھ لے گئے تھے اس لیے انھوں نے جواب دینے میں کچھ تامل کیا۔ ابی قحافہ گویا ہوئے کہ ابوبکر سارا اثاثہ ساتھ لے گیا ہوگا۔ حضرت اسماؓ نے اشرفیوں سے ملتے جلتے کچھ کنکر ایک جگہ رکھ کر اوپر کپڑا ڈال دیا اور اپنے نابینا باپ سے کہا کہ خود ٹٹول کر دیکھ لیں گھر میں ابھی بہت سامال ومتاع موجود ہے۔ اللہ اللہ! خاندانِ ابوبکرؓ کا یہی وہ جذبۂ محبتِ رسولؐ تھا جس کے پیشِ نظر حضورؐ نے بے ساختہ ارشاد فرمایا کہ میں نے تمام لوگوں کے احسانات کا بدلہ اتار دیا مگر ابوبکرؓ کے احسانات کا بدلہ اللہ عطا کرے گا۔ اور پھر غارِ ثور تک پہنچتے ہوئے دوشِ صدیقِ اکبرؓ نے جو منفرد اعزاز وسعادت حاصل کی وہ طلوعِ خورشیدِ قیامت تک اس چرخِ نیلی فام کے نیچے کسی اور کو حاصل نہیں ہوسکتی۔ افلاک جیسی بلندی پر واقع غارِ ثور پر چڑھتے ہوئے صدیقِ اکبرؓ نے جب چہرۂ رحمۃ للعالمینؐ پر گراں باری کے آثار دیکھے تو فوراً وجہِ تسکین وتخلیقِ ارض وسما کو اپنے کندھوں پر اٹھالیا۔ حضورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ابوبکرؓ! تم بارِ نبوت کو نہیں اٹھا سکتے۔ حضور سید المرسلینؐ کو معلوم تھا کہ اس کائناتِ ارضی میں اگر کوئی شخص بارِ نبوت اٹھانے کی صلاحیت و ہمت رکھتا ہے تو وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگرچہ یہ فقط صدیقِ اکبرؓ اللہ کی عطا اور حضورؐ کی چشمِ عنایت کا فیضان تھی لیکن مجرد پدر عائشہ صدیقہؓ کے حصے میں آئی۔

پھر یہ فیوض و برکات اور لامثال سعادتیں حاصل کرنے کا سلسلہ وسفر غار تک پہنچ جانے تک ہی تمام نہیں ہوا۔ ان تین ایام کے قیام کے دوران چشمِ صدیقِ اکبرؓ نے عدیم النظیر، روح پرور اور حیات بخش نظارہ ہائے ارتفاع کا مشاہدہ کیا اس کے اظہار کے لیے جنبشِ قلم اور وسعتِ قرطاس عاجز نظر آتی ہے۔ عزیز از جان ودل، اپنی متاعِ دین ودنیا، اپنے آقا ومولا کو چند ثانیوں کے لیے جناب ابوبکرؓ غار کے اندر تنہا جا کر اپنی پلکوں سے جاروب کشی کا فریضہ انجام دیتے ہیں، وہاں تمام سوراخوں کو ایک ایک کر کے بند کرتے ہیں تاکہ حشرات الارض میں کائنات کی سب سے مقدس ہستی کو کوئی گزند نہ پہنچا سکے۔ صرف ایک سوراخ باقی رہ گیا۔ اس پر اپنی ایڑی رکھ کر جان نثارِ مصطفیؐ دست بستہ عرض کرتے ہیں: حضورؐ! میرے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں! اب اندر تشریف لے

آئیں۔ حضورؐ چوں کہ شدت سے تھکاوٹ محسوس فرما رہے تھے اس لیے آغوشِ صدیقِ اکبرؓ میں سرِ اقدس رکھ کر محوِ استراحت ہو گئے۔ اب سیدنا صدیقِ اکبرؓ جی بھر کر قربتِ محبوبِ خدا کے مزے لے رہے ہیں۔ آنکھیں ایک لطف آمیز تسلسل کے ساتھ روئے رسالت مآبؐ سے چھننے والے انوار و تجلیات سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ قربتوں کی انھی انتہاؤں کے پیشِ نظر سیدنا عمرِ فاروقؓ نے حسرت آمیز انداز میں ارشاد فرمایا تھا کہ میرے دامنِ حیات میں موجود تمام نیکیاں ابوبکر لے لیں اور مجھے غارِ ثور والی تین راتوں والی سعادت عطا کر دیں۔ فقط کشتگانِ خنجرِ تسلیم ہی سیدنا ابوبکرؓ کی اس منفرد سعادت کی لطافتوں اور نزاکتوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ چشمانِ ابوبکرؓ کس کیف و سرور کے ساتھ جمالِ مصطفیؐ کی تابش سے مستنیر ہو رہی ہوں گی۔

اُس مرکزِ جمال پہ ہے اب ہے مری نظر
جلوے بھی دیکھ لیں تو طوافِ نظر کریں

جس وقت حریمِ حسن سے چھن چھن کے روشنی برس رہی تھی اور صدیقِ اکبرؓ کی آنکھوں میں سما رہی تھی اس کیفیت کی منظر کشی کرنا کیا کسی مصور کے بس میں ہے؟ جس حسنِ ازل کے سبب اللہ رب العزت تخلیقِ کائنات پر مجبور ہو گیا، جس کے جمال کی وجہ سے نسیمِ صبح رحمتِ پروردگار میں بدل جاتی ہو، جس کی زلفِ عنبریں کی مہک سے خود برگہائے لالہ و گل محوِ خواب ہو جاتے ہوں، جس کے خزینۂ دردِ محبت سے ارواحِ انسانیت کو تسکین ملتی ہو، جس کی نعلینِ مبارک سے مس ہو جانے والے ذراتِ صحرا رشکِ آفتاب و ماہتاب بن جاتے ہوں، جس کی چشمِ مبارک کے سامنے نرگس بھی کشکولِ گدائی لیے کھڑی رہتی ہو، جس کے اشارۂ ابرو پر گردشِ لیل و نہار کا رخ بدل جاتا ہو، جس کے دیدار سے مشرف ہونے کے بعد عشاق گلستانِ عالم سے بے نیاز ہو جاتے ہوں، جن کا تصور ذہن میں آ جائے تو اہلِ بیاباں خود کو حسنِ گلستاں میں محسوس کرتے ہوں، جس ے پلک مبارک جھپکنے سے گلشن کے تمام پھول گوشۂ دامانِ آدمیت میں آ جاتے ہوں، جس کی بارگاہِ محبت میں پہنچنے کے بعد آشفتگانِ محبت کو تعیّشاتِ زمن ہیچ نظر آتی ہوں، شاعروں کا علوِ فکر اور نُدرتِ خیال جس کے تصورِ حسن سے خیرات حاصل کرتے ہوں، اُس وجہِ تزئینِ ارض و سما کے جمالِ جہاں آرا سے سیدنا صدیقِ اکبرؓ لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ حضرتِ ابوبکرؓ کی آنکھ جب اس سرمدی مخزنِ جمال سے دل و دماغ کو منور کرنے میں مصروف تھیں تو وہ سوراخ جس پر فداکارِ رسالت مآب نے اپنی ایڑی رکھی ہوئی تھی، اس میں موجود ایک زہریلے سانپ نے آپؓ کو ڈس لیا۔ اگر چہ درد میں بہت شدت تھی مگر فدائے رحمۃ للعالمینؐ نے اپنی آغوش میں محوِ استراحت، جان و روحِ کائناتؐ کو جگانا مناسب نہ سمجھا، مبادا سکون و راحتِ سرورِ کائناتؐ میں خلل آ جائے۔ مگر جب درد کی شدت حد سے بڑھنے لگی تو آپؓ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ جب اشک ہائے صداقت، رخسارِ نبوت پر گرے تو رحمۃ للعالمینؐ بیدار ہو گئے۔ فرمایا: ابوبکر! یہ آنکھ میں آنسو کیوں؟ دست بستہ عرض کیا: آقا! ایڑی پر سانپ نے ڈس لیا ہے مگر قرینہ ہائے احترام و عقیدت کے تقاضے مانع تھے اس لیے آپ کو جگانے سے گریزاں رہا۔ حکیمِ کائنات، مسیحائے موجوداتؐ نے ارشاد فرمایا: ایڑی قریب لاؤ! آپؐ نے اپنا لعابِ دہن متاثرہ جگہ پر لگایا تو آپؓ کو اس طرح آرام آ گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جس کی نگاہِ انگبیں خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر سکتی ہو اس ذاتِ گرامیؐ کی موجودگی میں کسی اذیت کا امکان باقی رہتا ہے؟ اُدھر کفارِ مکہ پاگلوں کی طرح ان دو نفوسِ قدسیہ کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ایک رات اتفاق سے وہ نقشِ کفِ پائے مصطفیؐ و رفیقِ مصطفیؐ کی تلاش میں غار کے دھانے کے اس قدر قریب پہنچ گئے کہ ان کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ سیدنا صدیقِ اکبرؓ نے محض اس خدشے کی بنیاد پر کہ کہیں دولت و امانتِ ربِّ کائنات کو کوئی گزند نہ پہنچے، بارگاہِ رسالت میں عرض کیا: آقا! کہیں یہ دشمن ہمیں دیکھ نہ لیں! صاحبِ عزیمت و بسالت اور کائنات کے سب سے جری انسان نے پوری استقامت سے فرمایا: غم نہ کرو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ از روئے قرآن یہیں پہ صدیقِ اکبرؓ کو ثانی اثنین کی نویدِ جاں فزا عطا ہوئی اور شرفِ صحابیت کا واضح شرف حاصل ہوا۔

لیکن برا ہو احمقانہ اور متعصبانہ اندازِ تفکر کا کہ نقادانِ رفیقِ نبوت، حضورؐ کی جان کے تحفظ کے خدشے کو جنابِ ابوبکرؓ کی بزدلی سے تعبیر کر رہے ہیں۔ یہ طعنہ زنی اس سراپا اخلاص و ایثار پر کی جا رہی ہے جس نے ہجرت سے چند یوم قبل ہی بیت اللہ میں ’’جرمِ حق گوئی‘‘ کی پاداش میں کفار سے ناقابلِ بیان اذیتیں سہی ہوں اور ہوش میں آتے ہی پہلا سوال یہ کیا ہو کہ میں اس وقت تک پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق سے نہیں اتاروں گا جب تک زیبائی رخِ مصطفیؐ کا نظارہ نہ کر لوں۔ افسوس کہ رفقائے نبوت پر اعتراض کے شوق میں آخرت میں جواب دہی کا احساس تک بھی جاتا رہا ہے۔ انھی بے سروپا الزامات اور تنقید نے ہی روحِ اتحادِ امت کو پارا پارا کر رکھا ہے۔ اللہ ہمیں اس بے وجہ منافرت و مخاصمت سے بچا کر اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

بلوچستان کا فارسی گو شاعر اور غالب کا پہلا معترض مولانا میرزا گل محمد ناطق مکرانی

مرزا کاظم رضا بیگ/

فاتح سندھ میر فتح علی خاں ٹالپر نے 9 محرم الحرام سنہ 1217ء کو وفات پائی۔ اس کی وفات کے چند گھنٹے پہلے اس کے یہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوئی جس کا نام میر صوبیدار خان ٹالپر رکھا گیا۔ چنانچہ اُسے پیدائش کے دوسرے دن ہی مسند نشین کر دیا گیا۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کو بعد میں سندھ کا حکمران تسلیم کیا جائے۔ اس کی نیابت اس کے چچا میر غلام علی خان ٹالپر نے سنبھالی۔ جس کی حیثیت میر فتح علی خاں ٹالپر کے زمانے میں وزیر خارجہ کی سی تھی۔ میر فتح علی خان ٹالپر ایک لائق اور مدبر حکمران تھا۔ وہ اپنی رعایا کو انتہائی خوش حال دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کے دربار سے مختلف اہل کمال وابستہ تھے۔ وہ شاعروں اور عالموں کی قدر دانی کرتا تھا اور ان کو وظیفہ بھی دیتا تھا۔ بیشتر اہل دانش اس کے خوانِ نعمت سے زلہ ربائی کرتے تھے۔ سفر اور حضر میں شاعروں اور عالموں کا مجمع اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کے شعری ذوق کا اندازہ لگانے کے لیے یہ کہنا کافی ہے کہ اس نے سسی پنہوں کے قصے کو مولانا جامی کی مثنوی، یوسف زلیخا کے طرز پر فارسی میں نظم کروایا۔ اس کے دربار سے کئی شعرا وابستہ تھے۔ ان شعرا میں سے بہت کا کلام کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

میر صوبدار خان ٹالپر نے بڑے ہونے کے بعد اپنے والد کی روایت اور اصول کو برقرار رکھا۔ اس کو علوم وفنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی تصانیف میں دیوانِ میر، مثنوی سیف الملوک، مثنوی جدائی نامہ (کلکتہ میں جلاوطنی کے زمانے کی یادگار) فتح نامہ سندھ (اس مثنوی میں ماہوڑوی کے زوال اور ٹالپروں کے اُٹھان کا حال ہے) مثنوی منہر و ماہ، خطوط (قریباً دس ہزار اشعار) مجربات طب وغیرہ پر مشتمل ہے۔ میر صوبدار خان ٹالپر، شاعروں اور عالموں کی بے انتہا قدر کرتا تھا۔ شاعری میں اس نے اپنا تخلص میر کیا تھا۔ اس کے دربار سے کئی شعرا وابستہ تھے۔ ان میں مولانا میرزا گل محمد ناطق مکرانی تھے۔ اس کے دربار سے وابستہ ہو کر بڑی شہرت پائی۔

گل محمد ناطق مکرانی کا اصل وطن مکران تھا۔ وہ وہیں پیدا ہوا تھا۔ اُس نے ابتدائی تعلیم وہیں پائی اور وہیں ہوش سنبھالا۔ غیر منقسم ہندوستان کی شاعری کی تاریخ میں بڑے بڑے نام سامنے آتے ہیں۔ جن میں ایک نام گل محمد ناطق مکرانی کا بھی ہے جو فارسی شاعری اور اپنے کردار کے باعث ایک الگ مقام رکھتا ہے لیکن یہ بات کسی ایسے المیہ سے کم نہیں کہ تاریخ اس کی ابتدائی زندگی و دیگر حالات کے متعلق کچھ زیادہ نہیں بتاتی۔ دوسری جانب اس تشنہ لب شاعر کے ساتھ کچھ کم سلوک روا نہ رکھا گیا تھا۔ کیونکہ بلوچستان میں تعلیمی پسماندگی کے سبب بلوچ اپنے اسلاف کے علم وادب وفنون لطیفہ، بہادری اور شجاعت کے تاریخی کارناموں کو کتابی صورت نہیں دے سکی۔ اگر اس ضمن میں چند کتابیں لکھی بھی گئیں تو وہ چند لوگوں کی ذاتی لائبریری تک محدود رہیں جو تاریخ تو نہیں البتہ تاریخ کے اوراق ضرور بن گئے۔

بلوچستان کے لوگوں کے ہاں کی تاریخ کو محفوظ رکھنے کا اپنا ایک الگ طریقہ رہا ہے۔ یہ کارناموں اور تاریخی، علمی اور فنی شخصیتوں کی تاریخ کو رزمیہ نظموں کے ذریعے سناتے تھے۔ یوں تاریخ قوم کے سینے میں محفوظ رہ جاتی ہے۔ گل محمد ناطق مکرانی بھی ان افراد میں سے تھے جنہوں نے تاریخ کو اپنی زبان میں بیان کیا۔ انہوں نے اپنے وطن مکران کے نام سے تخلص اختصار کیا۔ بلوچوں میں آج بھی وہ گل محمد ناطق مکرانی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پہلی بار مرحوم عبدالصمد سوبازی، سابق قاضی قلات نے ان کو سنہ 1933ء میں روشناس کرایا۔

چونکہ مکران میں اہل علم و اہل قلم کی تعداد کم تھی اس لیے ان کو شعر وادب سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا۔ ان کے یہاں اس وقت گل محمد ناطق مکرانی کے علاوہ اور کوئی بھی شاعر نہ تھا۔ ان کی ذوق شاعری کو سخت تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ معاشی طور پر بھی آپ کے حالات دگرگوں تھے۔ لوگوں کی کم مائیگی اور معاشی حالات سے تنگ آ کر انہوں نے اپنے آبائی وطن سے رختِ سفر باندھا اور حیدر آباد سندھ چلے گئے۔ ان دنوں سندھ پر ٹالپر حکمران تھے۔ انہوں نے میر صوبدار خان ٹالپر سے ملاقات کی جنھوں نے ان کے اندر پوشیدہ جوہر کو محسوس کیا اور اس کی عزت افزائی کی۔

تذکرۂ تکملۃ الشعراء کے مصنف مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی سے گل محمد ناطق مکرانی کے علم وفضل کی بڑی تعریف کی ہے اور اسے جامع کمالات اور حاوی محسنات قرار دیا ہے۔ اس نے تکملہ مقالات الشعراء میں لکھا ہے کہ میاں گل محمد ناطق مکرانی عربی میں فائق فارسی میں لائق تھا اور ان دونوں زبانوں پر اس کو اس قدر قدرت حاصل تھی کہ اس نے شرح وقایہ کو نصف سے زیادہ ازبر کرلیا تھا۔ وہ تمام ہدایہ فقہ اس کو یاد تھے۔ اس کا فارسی کلام سندھ کے رہنے والوں میں اکثر کو یاد تھا اور بہت کم لوگ ایسے تھے جن کو اس کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ الغرض وہ عجوبہ روزگار تھا۔

میر صوبدار خان ٹالپر انتہائی مردم شناس تھا۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں ناطق مکرانی کی صلاحیتوں اور لیاقتوں کو بھانپ لیا اور اپنے درباری شعرا میں جگہ دی اور اس سے کہا کہ وہ ''دلخوش'' (بلوچی میں اس کا مترادف دلوش ہے) تخلص اختیار

کرے۔ چنانچہ ناطق نے محض غزلوں میں دلخوش تخلص بھی اختیار کیا۔

حیدرآباد کے قیام کے دوران ناطق مکرانی کی ملاقات مخدوم محمد ابراہیم خلیل ٹھٹھوی (صاحب تذکرہ تکملہ مقالات الشعراء) کے والد مخدوم عبدالکریم ثانی المعروف دائم القیوم (المتوفی ۱۲۷۲ھ) سے بھی ہوئی۔ ناطق مکرانی نے ان کی صحبت میں روحانی علوم سے استفادہ کیا اور تصوف و معرفت میں اپنی معلومات بڑھائیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا کہ ناطق کا بیشتر وقت مخدوم عبدالکریم ثانی کی خانقاہ میں گزرتا تھا۔ ایک دن حضرت دائم الصوم نے ناطق مکرانی سے کہا کہ:

علم صحبت ما، تاثیر صحبت دلخوش است

ناطق مکرانی نے ایک دن ناراض ہوکر کہا تھا کہ:

آبرو گر طلبی آب مناری مطلب
لقمہ چرب بجز نانِ جواری مطلب

میاں عبدالغفور نے جواباً فرمایا:

آبرو گر طلبی آب مناری (۱) بطلب
لقمہ چرب مجوبانِ جواری مطلب

(۱) مناری، (میاری یا فارسی میں متصلوی) سندھ کا ایک قدیم علمی و ادبی شہر، جو حیدرآباد سندھ سے نزدیک ہے اور اب اسے ضلع کی حیثیت حاصل ہے۔

میر صوبدار خان ٹالپر کے دربار سے اس کو ایک روپیہ روزانہ ملتا تھا۔ یہ اس دور کے حالات میں بہت زیادہ رقم تھی۔ اس سے انسان بافراغت گزر بسر کرسکتا تھا لیکن ناطق مکرانی نے ہندوستان کے امیروں کی دلخوش داستانیں سن رکھی تھیں۔ اس نے سن رکھا تھا کہ دہلی اور اودھ کے صوبہ دار، شاعروں کو ہیروں اور جواہروں میں تول دیتے ہیں۔ خلعت اور پارچہ انعام دیتے ہیں اور ان کو ملک الشعراء کے مطاب کے ساتھ جاگیرداروں اور صوبہ داروں جیسا مقام دیتے ہیں۔ اگرچہ ناطق مکرانی کے پاس اس وقت کافی دولت تھی۔ وہ کسی انعام و اکرام کے بغیر بھی آسانی سے گزر بسر کر سکتا تھا لیکن اس کی خواہش امارت اسے مقطرت رکھتی تھی۔ وہ میر صوبدار خان ٹالپر کی فیاضی، انعام و اکرام کو معمولی سی چیز سمجھتا تھا۔ اس کی حد سے بڑی ہوئی خواہش اسے مطمئن نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن اس نے سندھ سے باہر جانے کا ارادہ کیا۔ میر صوبدار خان نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی۔ بہت طریقوں سے سمجھایا اور چاہا کہ وہ اس کے دربار سے وابستہ رہ کر آرام و اطمینان سے زندگی بسر کرے لیکن وہ نہیں مانا اور سندھ سے نکل کھڑا ہوا۔

سندھ میں آتے وقت ناطق مکرانی کو فارسی شاعری پر اس قدر قدرت تمام حاصل تھی کہ وہ بڑے سے بڑے فارسی شاعر کے جواب میں غزلیں لکھ سکتا تھا۔ ان کی زمینوں پر طبع آزمائی کرسکتا تھا۔ اس کے کلام کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ کبھی بھی ممیز کا شکار نہیں ہوا۔ اس نے غالب کے جواب میں غزلیں کہیں۔ طالب آملی کی شاعری کو جولان گاہِ طبع بنایا۔ اسیر اور مظہر کی غزلوں پر طبع آزمائی کی۔ بعض مقامات پر اس نے امیر خسرو اور عرفی کی بھی تتبع اختیار کی۔ اس کی ان بے پناہ صلاحیتوں کی وجہ سے عوام اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ سندھ کے حکمران ٹالپروں اور خصوصاً میر صوبدار خان ٹالپر کو بھی محبوب تھا اور وہ اس کی دلجوئی اور ہمدردی میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔

ناطق مکرانی کو سندھ میں ہر طرح کی آسائش اور سہولت میسر تھی۔ وہ حیدرآباد کے حکمران خانوادے کے شہزادے میر صوبدار خان ٹالپر کے درباری امیروں میں شمار ہوتا تھا لیکن اس کو مزید ترقی اور نام نمود کی خواہش تھی۔ اس نام و نمود اور ترقی کی خواہش نے اُسے حیدرآباد سے باہر نکالا۔ اس نے سندھ میں رہ کر اودھ کے نوابوں اور حکمرانوں کی فیاضی کی دلخویش کن داستانیں سن رکھی تھیں۔ وہ سوچتا تھا کہ اس نے اگر اودھ جا کر کسی امیر یا حکمران سے توسل پیدا کرلیا یا ان کے درباروں میں اس کی رسائی ہوگئی تو اس کے دن پھر جائیں گے۔ خوش فہمی ایسی تھی جس نے اس کو زندگی بھر پریشان اور مایوس رکھا۔ اس نے سندھ سے نکل کر ہندشریف کے مختلف درباروں کا رخ کیا۔

گل محمد ناطق مکرانی حیدرآباد سندھ کو چھوڑ کر دہلی کی جانب روانہ ہوگئے۔ وہاں شاعروں کی کمی نہ تھی۔ بہادر شاہ ظفر کے دربار میں کئی بلند پایہ فارسی اور اردو شعراء تھے اور مرزا اسداللہ غالب کی ناطق مکرانی سے دوستی ہوگئی اور آپس میں خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہوا۔ جن میں زبان اور شعر کے اچھے نکات ملتے ہیں۔ اس زمانے میں لکھنو کے نوجوان کی محفلیں خوب گرم ہوا کرتی تھیں اور دور دراز سے شاعر آکر وہاں جمع ہوتے تھے۔ ناطق مکرانی کو جب لکھنو کے نوابوں کے دربار تک رسائی حاصل ہوئی تو ان کے کلام سے وہ بے حد محظوظ ہوئے اور رفتہ رفتہ ان کو شاہانِ اودھ کے دربار کا شاعر مقرر کیا گیا۔ یہ ان کے لیے ایک اعزاز سے کم نہ تھا۔ وہ عموماً محمد علی شاہ امجد علی شاہ و امراء دولت پر قصیدے لکھتا تھا۔ شمع انجمن کے فاضل مصنف نے ناطق مکرانی کو اس دور کے بلند پایہ شاعروں میں شمار کیا ہے۔

ناطق مکرانی نے اودھ کے حکمران محمد علی شاہ اور ان کے بعد امجد علی شاہ کے دربار میں توسل پیدا کرلیا۔ وہ حکمران اپنی ذات میں علم پرور ادیب دوست مشہور تھے لیکن ان سے شاعروں اور ادیبوں کی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا۔ انہوں نے کسی ادیب کی سرپرستی کی اور نہ کسی شاعر کی۔ ان کے دور میں ان تمام شاعروں کو شدید مایوسی اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑا جو ان سے کسی قسم کی توقع رکھتے تھے۔ ناطق مکرانی کی قدردانی ان سے ممکن نہیں تھی۔ واجد علی شاہ اختر کا زمانہ آیا تو عیش و عشرت کے زنجیرے کھل گئے۔ رقص و سرود کی محفلیں برپا ہوئیں۔ گھر گھر شاعروں کی دھوم مچی، لیکن اس دور میں بھی ناطق کا بھلا نہیں ہوا۔ وہ بے اختیار اپنے وطن مکران اور سندھ کو یاد کرتا تھا۔ اس کو

وہاں سے بوئے دوستان و عزیزان آنے لگی۔ اودھ میں ناطق مکرانی پر کیا گزری، اس کا اندازہ ان خطوط سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو لکھے تھے۔ یہ خطوط اسی اعتبار سے بڑے المناک و دردناک ہیں کہ ان سے انہی شاعر کا حسرتناک دور یاد آتا ہے جو مزید ترقی اور انعام کے لالچ میں اپنے سرپرستوں اور محسنوں کو چھوڑ کر سندھ سے رخصت ہوا تھا اور یہ سمجھا تھا کہ دوسرے حکمران، سندھ کے حکمرانوں سے کہیں زیادہ اس کے قدردان ہوں گے اور اس کو ہیروں اور موتیوں میں تول دیں گے۔ ایک خط میں ناطق مکرانی نے لکھا کہ:

''میری بے سروسامانی کا اس بات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کئی راتوں سے میرے گھر کے ویرانے میں چراغ روشن نہیں ہوا ہے۔''

اودھ کے امیروں اور نوجوانوں نے ناطق مکرانی کی کس طرح سرپرستی کی اور کس طرح انعام و اکرام سے نوازا۔ اس خط کی مزید عبارت سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ ناطق نے لکھا کہ:

''گیارہ سال سے میں نے اپنے مربیوں کی فرمائش پر نظم و نثر میں سینکڑوں چیزیں لکھی ہیں لیکن حرمان و مایوسی کے علاوہ میرے ہاتھ کچھ بھی نہیں آیا۔ اگر میں یہ دماغ سوزی نہ کرتا تو اس وقت مجھے یہ تاسف اور افسوس نہ ہوتا۔''

اودھ میں ناطق مکرانی کی تباہ حالی اور مفلسی اس درجہ پر پہنچ گئی تھی کہ وہ مختلف لوگوں سے قرض لے کر اپنا رشتہ جان برقرار رکھنے پر مجبور تھا۔ اگرچہ لوگ اس کو قرض دیتے تھے لیکن جب وصولی کی کوئی توقع نہ ہوتی تو لڑنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ اس کی مجبوریوں کو بھی نہ قرار دیتے تھے۔ ان لوگوں کو ناطق مکرانی کی مختلف درباروں اور وابستگی کی بنا پر توقع تھی کہ اس کو امیروں سے ضرور آمدنی ہوتی ہے اور وہ یہ رقم ضرور ادا کرے گا۔ لیکن صورت حال بالکل برعکس تھی۔ ناطق مکرانی نے قرض خواہوں کی یورش کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں جس وقت بھی اپنے مربی کی قیام گاہ سے لوٹتا ہوں، قرض خواہوں کا اژدھام لگا ہوتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ میں کچھ انعام و اکرام لے کر آیا ہوں لیکن ان کے قرض نہیں لوٹاتا ہوں۔''

اس صورت حال سے ناطق مکرانی کی فکر اور سوچ میں بے زارگی، مایوسی اور جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی۔ اسے یہ بھی اعتراض تھا کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں اور لیاقتوں کے باوجود کسمپرسی اور ناقدری کا شکار ہے۔ چنانچہ اس نے کسی مصلحت اور تقاضے کو مدنظر رکھنے کے بجائے حق گوئی کو اپنا شعار بنایا اور اس سلسلہ میں کسی بھی قسم کی لگی لپٹی نہیں رکھی۔

چنانچہ جب ناطق مکرانی نے میرزا اسداللہ خان غالب کی مثنوی ''درد و داغ'' پڑھی تو اس پر اعتراض کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ غالب نے اس مثنوی میں ایک قصہ بیان کیا ہے جس کے مطابق ایک عورت کی دعا قبول ہوگئی اور وہ پھر سے جنونی ہوگئی۔ جوان ہوتے ہی اس کا انداز فکر بدل گیا اور اس نے اپنے شوہر کو ٹھکرا دیا۔ شوہر نے اس کی بے وفائی سے تنگ آ کر بددعا کی اور وہ فوک ہوگئی۔ اس واقعہ کو غالب نے اس شعر میں کہا ہے کہ:

فوک و شد و پنجہ زدن ساز کرد
ما سرو رو عربدہ آغاز کرد

ناطق مکرانی نے غالب سے اس شعر کا ذکر کرتے ہوئے ایک خط کے ذریعے پوچھا کہ اس شعر میں کاتب نے ایک لفظ ''صورت پنجہ'' لکھا ہے۔ یہ کیا لفظ ہے۔ اگر یہ لفظ ''پنجہ'' ہی ہے تو پھر فوک کے کم ہونے میں پنجہ نہیں۔ ناطق مکرانی کا یہ اعتراض اس قدر درست اور مدلل تھا کہ غالب کو اس کے اعتراض کو تسلیم کرنا پڑا۔ حالانکہ غالب نے کسی اعتراض کو برداشت نہیں کیا۔ ایک مرتبہ غیاث الدین مؤلف ''غیاث اللغات'' نے غالب کی بعض اغلاط گنوائی تھیں تو ان پر اس بری طرح سے ٹوٹ پڑے تھے کہ باقاعدہ مجادلہ کا آغاز ہو گیا تھا۔ ان کا یہی معاملہ قتیل کے حامیوں کے ساتھ بھی رہا تھا اور وہ ان کو زندگی بھر معاف کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے تھے لیکن ناطق مکرانی کے اعتراض کے آگے ان کی ایک بھی نہیں چلی۔ انہوں نے جواب میں اسی خیال کا اظہار کیا۔ غالب نے ناطق کو لکھا کہ:

''یہ سمجھتا تھا کہ فوک کتے اور بلی کے مانند ہوتا ہے۔ اب تمہارے خط سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے فوک کو دیکھا ہے۔ اس کے سُم ہوتے ہیں، پنجے نہیں۔ کاش تمہارا خط مثنوی، درد و داغ کے طبع ہونے سے پہلے ملتا اور میں اس مصرع کو بدل کر یوں کر دیتا:

فوک شد و بہ نفسی ساز کرد

مولانا میرزا گل محمد ناطق مکرانی وقتی طور پر خوشحال زندگی بسر کرنے لگا اور وہ مستقلاً لکھنو میں رہائش کا خواہش مند تھا۔ تاہم وہ اپنے وطن اور اہل و عیال کو فراموش نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:

صبا از جانب ناطق سلامی خاک مکران را
کہ من چون غنچہ دل در گلشن ہندوستان بستم

ایک اور جگہ یوں کہتا ہے:

اے عزیزان وطن دست بشوئید از من
کہ کشتہ ہندم و سبزان گلابی پوشش

ناطق مکرانی کا ایک بڑا مربی فوت ہوا اور اودھ میں انگریزوں کے سازشوں کے سبب افراتفری پھیل گئی۔ اس طرح ناطق مکرانی کی قسمت پھر پلٹ گئی۔ وہ دوبارہ معاشی طور پر بدحال ہو گیا۔ اس تباہ حالی اور تنگ دستی میں ان کو پھر اپنا آبائی وطن مکران اور اہل و عیال یاد آنے لگا۔ چنانچہ خود لکھتا ہے کہ:

ناطق چو بلا بہ ہر بد فال شدی
دور از وطن و عیال و اطفال شدی
شاعر شدہ از بہر فلاکت کم بود
کائی خانہ خراب بارز آل شدی

ایک اور جگہ اپنی مفلسی کی نسبت سے کہتا ہے کہ:

ناطق شد بجز گفتنے عاصلم ز دہر

آن ہم بمرد گور کنی گور کن گرفت

جس طرح نظامی گنجوی اپنی عرفانی مثنوی مخزن الاسرار کا آغاز ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' سے کرتا ہے۔ اسی طرح ناطق کے قصائد کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
آنکہ حکیم ست و علیم و کریم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
جہار جہان حادث و دانش قدیم
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
پیش ازل بعد قیامت مقیم

ناطق مکرانی کی شاعری غزلیات و قصائد پر مشتمل ہے۔ ان کے قصیدے زیادہ تر خطابیہ ہیں۔ دو قصیدے حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں ہیں۔ باقی قصیدے امرا و روساء کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ ناطق مکرانی، حضرت علی علیہ السلام کی مدح میں یوں رطب اللسان ہوتا ہے کہ:

آنچہ موسیٰ دید ور سینا بہ بینی ملی حجاب
سرمۂ چشمت شعر دگر خاک پائی بوتراب
تا بود جان دوتن و ہم بعد جاں رفتن زتن
باد در خاکِ نجف جائیم بحق بوتراب

درمدح نواب امین الدولہ بہادر:

کیست غیر از امین دولت و دین
آن و زبرکہ شہ نشان باشد
ایک در کشورِ شجاعت او
زال ہم پور داستان باشد
در نکو نیستی و نرم دلی
نام تو شہرۂ جہان باشد
ناطق انعام فولہ در گہ تست
مر ترا نیز دل نشان باشد

درمدح حسین آباد:

زہے بزیب علم در جہان حسین آباد
کہ دار دلش بجہان تا ابد حسین آباد
جہان پناہ محمد علی شہ عادل
کہ کندہ معہ نقش ظلم پیشہ را بنیاد

اس شہر کے آباد ہونے کی تاریخ یوں بیان کی ہے:

تو ان نمود کنوں اکتفا بنار بخش
کیسان خلد شد آباد ایں حسین آباد
(۱۲۵۶ھ)

مذکورہ قصیدے میں ناطق بھی عرفی کی طرح اپنی مدح سرائی اس طرح سے کرتے ہیں:

دریں زمانہ من آن شاعرم کہ نتوان یافت
نظیر من بہ سخن در قلمرو ایجاد
زبانِ طعنہ کشود ست بکر معنی من
بحسن شعرہ طراران خلخ و نوشاد
نگندہ زلزلہ بز ذوق شعر مالی من
سماع و لبستی بھرنا و جنید در بغداد

درمدح سلطان الم واجد علی شاہ اختر والی اودھ:

سپہر کوکبہ واجد علی شہ غازی
کہ نعل توسن قدرش ہی سزد ز ہلال
زہے کریم کہ در شہر بعد کر منت
بسا گدا نشود آشنا بحرف سوال
ہمیشہ گلشن عیش تو چون ریاض بہشت
شگفتہ تا دبہ الطاف ایزدِ متعال

قطعہ تاریخ تہنیت تولد خرزند سعید الدولہ بہادر

تہنیت باد تہنیت از ما
بجنابِ سعید دولت و دین
کہ خدا دادت این زمان پسرے
چہ پسر در چہ در در ثمین
گفت مال ولا دتش ناطق
آفتاب سپہر دولت و دین
(۱۲۶۱ھ)

ناطق مکرانی نے لکھنو میں بڑے بے سروسامان کی زندگی گزاری۔ عمر بھر افلاس اور فاقہ کا شکار رہے۔ امیرون کی مدح و ثنا کی۔ امین الدولہ کی مدح لکھی واجد علی شاہ کا قصیدہ سنایا۔ شرف الدولہ کا قصیدہ پڑھا، مجتہد العصر کی ستائش کی۔ قطب الدولہ کو ممدوح بنایا۔ اس کے باوجود اس کے حالات نہیں بدلے۔ مگر اس طویل اور حوصلہ فرسا زمانے میں اس کو سندھ کی یاد آنسوؤں سے رلاتی رہی۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں اور قدر دانوں کو یاد کر کے مچلتا رہا۔ کئی مرتبہ کوشش کی کہ اودھ اور لکھنو کے ظاہراً دلکش اور خوبصورت لیکن تیرہ اور فرسودہ ماحول سے نکل کر سندھ چلا جائے لیکن ہر بار یہ خیال اس کے پاؤں کی زنجیر بنا رہا کہ اب سندھ میں اسے کون پوچھے گا۔ اسی کسمپرسی اور بے کسی کے عالم میں اس نے 1264 سن مطابق سنہ 1848ء میں لکھنو میں انتقال کیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس کے پاس اس کا پورا کلام بھی مدون نہیں تھا۔ بعد میں اس کے شاگرد جواہر سنگھ جوہر نے اس کی نظمیں، غزلیں اور قصائد مختلف لوگوں سے جمع کیے اور ان کو جوہر معظم کے نام سے یکجا کر کے منشی نول کشور کے اہتمام سے شائع کروایا۔ اگر یہ مجموعہ شایع نہ ہوتا تو بہت سے لوگ اس کی شخصیت اور کلام کے استفادہ سے محروم رہے۔''

خدا رحمت کند این عاشقانِ پاک طینت را

ماخذ و مراجع:

(۱) جوہر معظم، نونتائج طبع بحر و کانِ سخنائی مولانا میرزا گل محمد ناطق مکرانی، مقدمہ، ڈاکٹر انعام الحق کوثر، سنہ ۱۹۶۸ء، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔

(۲) ناطق مکرانی، انعام الحق کوثر، برنل پاکستان سٹاویل سوسائٹی کراچی، اکتوبر ۱۹۶۱ء

(۳) بلوچستان میں فارسی شاعری از ڈاکٹر انعام الحق کوثر، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ ۱۹۶۸ء

عماد اظہر/اسلام آباد

اتنے پیوند ہیں اسرارِ فقیری پہ کہ اب
صاحبِ فقر کو احساسِ قبا ہے بھی نہیں

ظہور ذات تھا اور رنگ دائرے میں تھے
درونِ خواب ہم اپنے ہی تجربے میں تھے
سمٹ چکی تھی دریچوں میں رات کی خوشبو
اور ایک صبح کے آثار ملگجے میں تھے
پھر ایک روز نکالا گیا ہمیں تم سے
کئی زمانوں سے ہم ایک دوسرے میں تھے
جب آگ اپنی حفاظت میں لے رہی تھی مجھے
تو مجھ میں سوئے ہوئے اسم جاگنے میں تھے
چراغ دیدۂ تر سے درود پڑھتے ہوئے
نقوش حجرۂ درویش دیکھنے میں تھے

باعثِ اجر پسِ روزِ جزا ہے بھی نہیں
ہو بھی سکتا ہے خدا اور خدا ہے بھی نہیں
میں میسر تھا اسے اور میسر کے لیے
اس زمانے میں کوئی خاص جگہ ہے بھی نہیں
ایک تو سانس میں اٹکا ہے کوئی سنگ سیہ
دوسرا سطحِ سمندر پہ ہوا ہے بھی نہیں
اتنے پیوند ہیں اسرارِ فقیری پہ کہ اب
صاحبِ فقر کو احساسِ قبا ہے بھی نہیں
ندرتِ خواب بے آواز کے سائے میں کہیں
اور اس خوابِ قدیمی کو پتہ ہے بھی نہیں

درویش بارگاہِ خدا پر نہیں رہا
اب اس کا انحصار جزا پر نہیں رہا
اک چشمِ خوش گمان چراغوں میں بجھ گئی
اور داغِ انتظار قبا پر نہیں رہا
وہ جانبِ سکوتِ بیاباں ہو گیا
جو راہ گیر میری صدا پر نہیں رہا
بے خواب سی نگاہ مجھے دیکھنے تو دے
یہ کس کا نام دستِ عطا پر نہیں رہا

صورتِ گوشۂ پوشاک ہوئے پاک ہوئے
ہم چراغوں کے لیے طاق ہوئے پاک ہوئے
جانے کس سمت لیے پھرتا فقیری کا غرور
صاحبو! شکر ہے ہم خاک ہوئے پاک ہوئے
یہ مدینہ ہے یہاں رنج و الم کوئی نہیں
جو گنہ گار بھی عشاق ہوئے پاک ہوئے
جو اُترتے ہی نہ تھے دل کے ترازو پہ کھرے
وہ بھی جب دیدۂ نمناک ہوئے پاک ہوئے

طلوعِ لمحۂ اشراق بھی سمجھتے ہیں
فقیر جنبشِ افلاک بھی سمجھتے ہیں
وہ لوگ کیسے مدینہ سے لوٹ آتے ہیں
جو اپنے آپ کو عشاق بھی سمجھتے ہیں
بتانے والے بتاتے ہیں روشنی کا ظہور
سمجھنے والے بجھے طاق بھی سمجھتے ہیں

خدا برائے تصرف ہے روشنی مجھ میں
کہ جی رہا ہے زمانوں سے زندگی مجھ میں
درود پاک کی خوشبو سے جان پاتا ہوں
کوئی فقیر ہے جس کی ہے جھونپڑی مجھ میں
میں جاگتے ہوئے اک خواب میں اُتر آیا
پھر اس کے بعد مری آنکھ کھل گئی مجھ میں
میں جس خدا کے قبیلے کا فردِ آخر ہوں
اسی کا عہدِ تسلسل ہے آخری مجھ میں

حیرتی چشمِ طلسمات نے محفوظ رکھا
آئینہ عکس کی خیرات نے محفوظ رکھا
جن صحیفوں میں بہت ذکرِ محمدؐ تھا انہیں
اک جگہ ارض و سماوات نے محفوظ رکھا
جو کبھی باعثِ عزت تھیں محبت کے لیے
ایسی قدروں کو مضافات نے محفوظ رکھا
اک نشانی رہے عبرت کے لیے دنیا میں
چند اینٹوں کو فسادات نے محفوظ رکھا
حالتِ جذب میں جو سنگ گزرگاہ رہیں
ان فقیروں کو کرامات نے محفوظ رکھا

دلچسپ دیکھنے کو نظارہ تھا ناؤ میں
دریا میں ناؤ اور کنارہ تھا ناؤ میں
بہتے ہوئے چراغ سے رہتی تھی گفتگو
پانی میں طاق اور ستارہ تھا ناؤ میں
پیروں میں سیپیاں تھیں سمندر کی صبح دم
میں نے تمام خواب گزارا تھا ناؤ میں

حلقۂ آب سے تصویر اُٹھائی میں نے
دوسری شکل بھی اپنی ہی بنائی میں نے
اسم اور جسم کی تعلیم مکمل دے کر
ساتویں دن مجھے آواز لگائی میں نے
گونج تو گونج ہے سننے سے سمجھ آتی ہے
یہ الگ بات کہ بہروں کو سنائی میں نے
نعرۂ عشقِ فسوں چیخ اُٹھا زنداں میں
تب کہیں پاؤں کی زنجیر ہلائی میں نے
پڑھ سکوں آیتِ اثباتِ نفی کو شاید
اس سمندر میں اگر ناؤ جلائی میں نے

اویس ضمیر/لاہور

بھرے پڑے ہیں کتابوں میں عشق کے قصے
کسے خبر کہ ہوا کیا مری کہانی کا

بنے ہیں شہر میں کیا کیا کمال کے قصے
تری ادا، ترے حسن و جمال کے قصے

مجھے غلاموں سی نسبت رسولؐ سے کافی
بہت مرے لیے زیدؓ و بلالؓ کے قصے

میں ڈھونڈنے تو جواہر خرد کے نکلا تھا
سمیٹ لایا ہوں سارے خیال کے قصے

مری قبیل کے شاعر ہی پھر سناتے ہیں
گئے زمن کے عروج و زوال کے قصے

ہوا جو وقتِ سفر زادِ راہ باندھ لیا
چلا ہوں شہر سے کاندھے پہ ڈال کے قصے

کہاں گزار دیا یک نفس جوانی کا
نفس شماری ہے اب نام زندگانی کا

فلک بجھے ہوئے تاروں سے بے نیاز بنا
تماشا دیکھ رہا ہے جہانِ فانی کا

بھرے پڑے ہیں کتابوں میں عشق کے قصے
کسے خبر کہ ہوا کیا مری کہانی کا

فلک سمو نہ سکا اپنی وسعتوں میں تجھے
مکان دل ہے مگر تیری لامکانی کا

مَیں دیکھتا ہوں سمندر کو خواب میں اکثر
بنا ہے اشک عبارت تمام پانی کا

اُلجھ رہے ہیں خیالوں سے اب حروف مرے
لحاظ کیسے رکھوں شعر میں روانی کا

مرے خیال سے زندہ ضمیر ہے ورنہ
جہاں مقام نہیں خیر کی نشانی کا

نشانِ دل نہ ملا اتنے گوشواروں میں
ہمیشہ نفع ہوا عشق کے خساروں میں

جنوں تھا قید کشش کے کڑے حصاروں میں
خرد بھٹکتی رہی اپنے ہی مداروں میں

شبِ فراق! ترے نیلے آسمان کی خیر
کوئی بھی عکس جھلکتا نہیں ستاروں میں

فلک سے کیسے میں شکوہ کروں خزاؤں کا
چمن اُجڑتا رہا ہے مرا بہاروں میں

ترے کلام میں مبہم کئی اشارے تھے
تلاش کرتا رہا خود کو ان اشاروں میں

بچا ہی کیا ہے مرے ہم نشیں جو میں دیکھوں
نیا تو کچھ بھی نہیں آج کے نظاروں میں

زمیں رہی نہ رہی آسماں خرید لیے
گھروں کو بیچ کے ہم نے مکاں خرید لیے

غرورِ زہد و خرد میں حکیم و مُلّا نے
یقیں کے بدلے یہ کیسے گماں خرید لیے

چمن کا رنگ ہے پھیکا، مہک فضا میں نہیں
خزاں نے سارے گل و گلستاں خرید لیے

اس آس پر کہ ڈھلے گی کساد بازاری
غمِ جہاں ہی دکاں در دکاں خرید لیے

متاعِ ذات رکھا دی فریب کو گروی
ملالِ حشر و غمِ جاوداں خرید لیے

ہے جیسے کوئی خریدار شہر کی رونق
کہ جس نے فکر کے سب پاسباں خرید لیے

رہے فریبِ عقیدت میں جب گریزِ عمل
تو کیوں گمان تھا دونوں جہاں خرید لیے

دو ایک سجدے ریا کے ادا کیے جن سے
جبین کے لیے کالے نشاں خرید لیے

پڑاؤ ڈالے کہاں قافلہ غمِ دل کا
غمِ جہاں نے سبھی آستاں خرید لیے

بنا ضمیر بھی اب تو ضمیر کا قیدی
کہ ظلم نے درِ آہ و فغاں خرید لیے

پہلے کچھ بنوں گا مَیں
تجھ سے پھر ملوں گا مَیں
سوچتا ہوں سوچ کر
کچھ نیا لکھوں گا مَیں
شور ہو کہ خامشی
گونجتا رہوں گا مَیں
"مَیں نے یہ کہا تو تھا"
پھر نہیں کہوں گا میں
مہر سا طبق طبق
ایک دن چڑھوں گا مَیں
تیرا حالِ حشر میں
دیکھ کر ہنسوں گا میں
اپنی سب شکایتیں
آپ ہی سنوں گا مَیں
تیری سب عنایتیں
رات بھر گنوں گا مَیں
پھر دھڑک اُٹھا ہے دل
پھر ذرا جیوں گا مَیں

پروفیسر محمد خالد کھوکھر/احمد پورلما

تمام عمر اذیت کی قید میں رکھا
بتایا کچھ نہیں اُس نے مرا گناہ مجھے

وہ جس کو یاد رکھنا ہے اُسی کو بھول جاتا ہوں
مرا مطلب ہے اپنی زندگی کو بھول جاتا ہوں
عجب سیماب پیکر ہے ٹھہرتی ہی نہیں آنکھیں
اُسے جب دیکھتا ہوں روشنی کو بھول جاتا ہوں
یہ کوئی حادثہ ہے اتفاقاً ہے کہ مجبوری
تمھی ہو ذہن میں میرے تمھی کو بھول جاتا ہوں
جو دُکھ منسوب ہے اُس سے فقط دکھ مت اُسے سمجھو
وہ مل جائے تو میں اپنی خوشی کو بھول جاتا ہوں
مرا اتنا بھی ناپختہ نہیں ہے حافظہ خالدؔ
مگر دانستہ میں اُس کی گلی کو بھول جاتا ہوں

ضرورت سے زیادہ سوچنا اچھا نہیں ہوتا
نظر بھر کر کسی کو دیکھنا اچھا نہیں ہوتا
کوئی تصویر آنکھوں سے ہتھیلی پر اُتر آئے
اُسے پھر بے تکلف چومنا اچھا نہیں ہوتا
کسی حد تک اگرچہ ضبط لازم ہے محبت میں
مگر سیلِ رواں کو روکنا اچھا نہیں ہوتا
مجھے اپنا سمجھتے ہو تو میری جاں بھی حاضر ہے
یوں غیروں کی طرح کچھ پوچھنا اچھا نہیں ہوتا
اُسے سمجھاؤ خالدؔ دل میں گنجائش کرے پیدا
کہ ہر اک بات پر یوں روٹھنا اچھا نہیں ہوتا

گملوں میں جو پودے ہیں لگائے ہوئے میں نے
تنہائی کے ساتھی ہیں بٹھائے ہوئے میں نے
یوں ہی تو نہیں شور مچاتی ہوئی لہریں
دریا میں ہیں سب اشک بہائے ہوئے میں نے
ایسا تو نہیں ہے وہ مجھے بھول گئے ہیں
جو لوگ ہیں دانستہ بھلائے ہوئے میں نے
اس چھت پہ اُترتے ہیں کہ گرتے ہیں کہیں اور
سوچوں کے پرندے ہیں اُڑائے ہوئے میں نے
غیروں کا بھی ہر کام مجھے یاد ہے خالدؔ
اپنوں کے بھی ہیں بوجھ اُٹھائے ہوئے میں نے

خواب ہر قصہ کہانی اور بس
اک معمہ زندگانی اور بس
اس ریاست کی حقیقت ہے عجب
رہزنوں کی حکمرانی اور بس
زندگی کا بس اثاثہ ہے یہی
چند یادوں کی نشانی اور بس
زندگی کرب و اَلم کا نام ہے
چند روزہ شادمانی اور بس
سب کو خالدؔ شوق دولت کا ہوا
ہو گئی دنیا دِوانی اور بس

یہ فیصلے کی گھڑی ہے، سُن اے گواہ! مجھے
کہیں تُو بدلے تو کردیں نہ سب تباہ مجھے
مگر یہ لوگ مرا کیا بگاڑ سکتے ہیں
مِرے کریم! تری چاہیے پناہ مجھے
تمام عمر اذیت کی قید میں رکھا
بتایا کچھ نہیں اُس نے مرا گناہ مجھے
اسی لئے تو تیرے ساتھ ساتھ رہتا ہوں
دکھائے گی تُو اُجالا شبِ سیاہ مجھے
میں اپنی جنگ اکیلا لڑوں گا اب خالدؔ
اگر مِلا نہ کوئی اپنا خیر خواہ مجھے

زندگی بوجھل سی لگنے لگ گئی
روشنی اوجھل سی لگنے لگ گئی
جو جگہ لگتی تھی جائے عافیت
اب وہی مقتل سی لگنے لگ گئی
کیا بتائیں بعد اُس کے دوستو!
زندگی بھی تھل سی لگنے لگ گئی
ہجر کی ساری زمیں تھی کھردری
اب وہی ململ سی لگنے لگ گئی
افراتفری اس قدر خالدؔ ہوئی
ایک خواہش شل سی لگنے لگ گئی

جدھر دیکھیے حشر سامانیاں ہیں
پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں
گلستاں ہو یا ہو وہ صحرا نظر میں
بہت دُور تک صرف ویرانیاں ہیں
مصائب سے ہر کوئی سینہ سپر ہے
میسر یہاں کس کو آسانیاں ہیں
وہ مر کر بھی مرتے نہیں ہیں جہاں میں
وطن کے لیے جن کی قربانیاں ہیں
خطاکار سارے مزے میں ہیں خالدؔ
کہ ہر بے خطا پر نگہبانیاں ہیں

تری جدائی میں جس وقت ڈگمگاتا ہوں
غمِ حسینؑ تصور میں لے کے آتا ہوں
اُسے میں سوچوں مسلسل تو دل ہی پھٹ جائے
سو، یاد کرتا ہوں اور اُس کو بھول جاتا ہوں
وہی تو ہے جو مری شاعری کا حاصل ہے
اُسی کو ذہن میں لاکر غزل سناتا ہوں
کبھی جو خواب تھے اب زخم بن گئے ہیں مرے
گریں زمیں پہ تو پلکوں سے میں اُٹھاتا ہوں
میں پہلے چاک پہ رکھتا ہوں خاک کو خالدؔ
پھر اپنے ہاتھوں سے میں اپنی خاک اُڑاتا ہوں

سگریٹ نوشی

عطاء الحق قاسمی

میں سگریٹ نوشی سے عاجز آ چکا ہوں اور خود کو تسلی دینے کے لئے اس حوالے سے سگریٹ نوشوں نے جو لطیفے گھڑے ہوئے ہیں وہ اپنے ہمدردوں کو سنا کر یہ ثابت کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں کہ سگریٹ ایک بے ضرر سی چیز ہے۔ اس حوالے سے میں اپنے مرحوم بھائی جان ضیاالحق قاسمی کا وہ واقعہ نما لطیفہ ضرور سناتا ہوں جس کے مطابق بھائی جان کو جب دل کا دورہ پڑا اور وہ اسپتال میں داخل تھے، ڈاکٹروں نے انہیں سختی سے کہا کہ اگر انہوں نے سگریٹ نہ چھوڑے تو ان کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جا سکے گی۔ مگر ایک روز جب انہیں سگریٹ کی بہت زیادہ طلب ہوئی تو وہ آئی سی یو سے باہر نکلے اور لفٹ خراب ہونے کی وجہ سے تین منزل نیچے سیڑھیوں سے اتر کر سگریٹ کی تلاش میں نکلے اور کافی دور جا کر ان کی نظر ایک پان سگریٹ کی دکان پر پڑی۔ اس سے تین سگریٹ خریدے اور بڑے سکون سے ان کے لمبے لمبے کش لگانے کے بعد واپس سیڑھیاں چڑھ کر آئی سی یو میں پہنچے اور بیڈ پر لیٹ گئے۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر آیا تو کچھ بتائے بغیر گھبراہٹ کے عالم میں ڈاکٹر نے کہا کہ ان کا بی پی چیک کریں۔ ڈاکٹر نے بی پی چیک کرنے کے بعد کہا، ''ضیاء صاحب آج آپ کی حالت بہت بہتر ہے پرہیز اسی طرح جاری رکھیں'' اب میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ ''ظرافت'' کے ایڈیٹر اور لاجواب فکاہیہ شاعر اور قہقہوں سے بھری ثقافت کے حامل ضیاء الحق قاسمی نے یہاں بھی ظرافت کی پھلجھڑیاں چھوڑی ہوں گی کہ بڑے بھائی کے حوالے سے چھوٹا بھائی یہ جسارت کیسے کر سکتا ہے؟ تاہم حقیقت یہی ہے کہ سگریٹ کے اثرات بھگت رہا ہوں مگر میں تو کئی دفعہ اس لعنت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر چکا، تین چار دفعہ میں نے سارا اسٹاک سامنے رکھ کر اس پر پٹرول پھینکا اور پھر تیلی جلا کر اس پر پھینک دی اور اسے خس و خاشاک میں تبدیل کر دیا مگر اگلے ہی دن بہادر سے پوچھا تھا یار کوئی ایک آدھ سگریٹ ہے؟۔

ایک بار میں نے سوچا کہ اس شعبے کے ممتاز طبیب ڈاکٹر صداقت علی سے مشورہ بلکہ علاج کراؤں۔ مجھے میرے بیٹے نے ان کے پاس جانے کے لئے کہا تھا چنانچہ میں اس مہربان شخصیت کے پاس گیا اور وہاں جا کر حیران رہ گیا کہ ایک بڑی عمارت میں ان کا سیٹ اپ تھا وہاں نشے کے عادی مریض بھی مختلف کمروں میں رکھے گئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ نشے کی بازیابی نہ ہونے کی صورت میں ان کی چیخ و پکار سنائی دیتی ہوگی مگر وہاں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ میں نے سوچا ان کا پراپر علاج ہوتا ہوگا ان کو عقل آ گئی ہوگی اور یا پھر (از راہ تفنن) ان کے کمرے ساؤنڈ پروف ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب بڑی محبت سے ملے میں نے انہیں کونسلنگ کیلئے نہیں کہا کہ اس موضوع پر میں خود کسی عادی سگریٹ نوش کی کونسلنگ کر سکتا ہوں اور یہاں داخل ہونے کا نہ انہوں نے کہا نہ میرا ایسا کوئی ارادہ تھا بس کافی دیر تک بہت اچھی گپ شپ کی اور چائے پی کر خیر سے بدھو گھر کو لوٹے۔ میں نے اس موذی سگریٹ نوشی سے جان چھڑانے کے لئے کیا کیا جتن کئے یہ داستان بھی ہے، ان میں سے ایک جتن یہ بھی تھا کہ جن دوستوں کی سگریٹ نوشی کی ''کفالت'' ایک عرصے سے میرے ذمے تھی میں نے کوشش کی کہ اب وہ میری ''کفالت'' شروع کریں چنانچہ میں نے ان سے سگریٹ مانگ کر پینے شروع کئے یہ سلسلہ صرف چند روز چل سکا ان میں سے ایک دوست جو پیکٹ میں صرف ایک سگریٹ اور باقی مختلف جیبوں میں رکھتا تھا وہ پیکٹ میں سے ایک سگریٹ نکال کر خالی پیکٹ پھینک دیتا تھا اور یوں تاثر دیتا تھا کہ سگریٹ کے حوالے سے اب وہ کنگال ہو گیا ہے۔ ایک اور دوست اس سے بھی ''دانا'' تھا وہ ایک سگریٹ نکال کر باقی پورا پیکٹ پھینک کر یہ تاثر دیتا تھا کہ اب اس کے پاس کچھ نہیں رہا اور جاتی دفعہ ادھر ادھر دیکھ کر وہ ''خالی'' پیکٹ اٹھا کر دوبارہ جیب میں رکھ لیتا تھا مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ پول تو ایک دن کھلنا ہی ہوتا ہے سو ان دونوں کی اسٹریجی کا سب کو پتہ چل گیا اور اس کے بعد ان دونوں کو ''گیدڑ کٹ'' لگا دی گئی۔ ''گیدڑ کٹ'' کے دوران ''ملزم'' پر کمبل ڈال دیا جاتا ہے اور پھر سب باری باری اس پر ''طبع آزمائی'' کرتے ہیں اور چونکہ وہ ضرب لگانے والوں کو دیکھ نہیں سکتا چنانچہ اس موقع پر پرانی دشمنیاں بھی نکالی جاتی ہیں۔

اب اس صورتحال کو حکومت نے مزید ''سنگین'' بنا دیا ہے متذکرہ صورتحال کے بعد سے مجبوراً اپنی جیب سے خریدتے ہوئے سگریٹ پینا پڑ رہے تھے۔ اب حکومت نے سگریٹ کا جو پیکٹ تین سو میں ملتا تھا اس کی قیمت پانچ سو کر دی ہے اب ہم جیسے مسکین لوگ جو سگریٹ چھوڑنا چاہتے ہیں اور اس حوالے سے بارہا ''پرخلوص'' کوششیں بھی کر چکے ہیں مگر اب تو مرے کو مارے شاہ مدار والی کیفیت پیدا ہو گئی ہے اور اس کے باوجود میں سگریٹ کی مہنگائی سے خوش ہوں بلکہ حکومت سے مطالبہ کروں گا کہ وہ چار گنا زیادہ مہنگے کرے تا کہ میری کوششیں عملی صورت اختیار کر سکیں۔ بس اس حوالے سے شرط یہ ہے کہ پیسہ حکومت کے پاس جائے لٹیرے، بلیک میلرز اور ذخیرہ اندوزوں کی جیب میں نہیں میں اس کالم کا اختتام کرنے ہی کو تھا کہ ایک خوفناک قسم کا سگریٹ نوش میرے پاس آیا اور پوچھا ''کیا لکھ رہے ہو؟'' میں نے بتایا تو بولا ''تمہیں پتہ ہے کہ ماسکو میں فیض صاحب کی وفات کا کیا سبب تھا؟ میں نے کہا نہیں، جس پر اس بقراط نے کہا، اس لئے کہ روسی ڈاکٹروں نے فیض صاحب کے سگریٹ اور وسکی دونوں پر پابندی عائد کر دی تھی جو ان کے جسم کی کیمسٹری میں شامل تھے بس اس کے بعد ان کی وفات کا افسوسناک واقعہ پیش آیا''۔

اس من مانی توجیہہ پر صرف حیرت کی ہی کہا جا سکتا ہے!

میں عام آدمی ہوں مجھے مار ڈالیے

پروفیسر نور کمال شاہ

ہاں جی! بات عام آدمی ہی کی ہو رہی ہے۔ وہ، کہ اخبارات کے صفحے جن کے ذکر سے بھرے رہتے ہیں اور ٹی وی چینلز جن کے مسائل کا واویلا مچا مچا کر نام اور دام دونوں کمانے میں مصروفِ کار رہتے ہیں؛ سوشل میڈیا فیس بک اور ٹویٹر وغیرہ کے پیجز جن کے دم قدم سے زندہ و پائندہ ہیں، اہلیان سیاست جسے اپنا پیر و مرشد تصور کرتے ہیں، وہ لافانی انسان اور بے انتہا قوتِ برداشت کا حامل بندہ جسے دنیا ''عام آدمی یا کامن مین'' کے نام اور مقام سے جانتی، پہچانتی اور پکارتی ہے؛

جی بالکل، وہی عام آدمی جس کی شہرت اور مقبولیت سے متاثر ہو کر ہمارے پڑوسی ملک میں ''عام آدمی پارٹی'' کے نام سے باقاعدہ ایک سیاسی تنظیم قائم کی جا چکی ہے اور جو آج کل بڑی تیزی سے کامیابیاں بھی سمیٹ رہی ہے۔

آخر کون ہے یہ عام آدمی۔۔۔؟

کب اور کہاں سے آیا ہے یہ عام آدمی۔۔۔؟

ملک میں مہنگائی کا شور اٹھا تو فوراً ہی اسے آرام کی میٹھی گولی کھلا کر صدائے اطمینان بلند کی گئی، ''قطعی امید ہے اس عارضی گرانی و مہنگائی سے عام آدمی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا!!!''

بجلی، گیس اور تیل کے نرخ بڑھے تو آرام و اطمینان سے سلائے رکھنے کے واسطے اسے قولی افیون کی جادوئی گولی تھما کر نوید سنائی گئی، ''ہمیں اپنے عام آدمی کی بڑی فکر ہے اور توقع ہے کہ ان اقدامات اور کٹھن فیصلوں سے ہمارا عام آدمی بالکل بھی متاثر نہیں ہوگا''۔

بیداری کے جراثیم حرکت کرتے دکھائی دینے لگے تو فوراً ہی مذہبی کیپسول کھلا کر اسے پرسکون نیند سلائے رکھنے کی کوشش کی گئی کہ ''اس فانی و ناپائیدار دنیا میں آرام و آسائش کہاں جی، مومن کی منزلِ مقصود تو اگلے جہاں کی راحتیں ہیں؛ یہ دنیا تو قید خانہ ہے اس کے لئے'' اور عام آدمی اسے مذہبی فرض سمجھ کر خوش، خاموش اور مطمئن بن بیٹھا۔

زلزلے آئے، سیلاب آئے، وبائیں پھیلیں، آفات مچیں، ہر جگہ باقاعدہ اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا کہ مقامِ شکر ہے، ہمارے بروقت اقدامات کے سبب عام آدمی مشکلات کا شکار نہ ہوسکا۔

مملکتِ خداداد میں جب جب ڈالر نے اونچی اڑان بھری اور مقامی کرنسی نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکے یا ماتھا زمین پر گھستی ہوئی سربسجود دکھائی دی، ہزار کا نوٹ سَو کی توانائی سے دوڑنے لگا، نرخ آسمان سے باتیں کرنے لگے؛ تو بلا تردد پکارا گیا، ''بحران سخت مگر عارضی ہے، یاد رکھیں کہ عام آدمی کو کسی بھی صورت میں متاثر نہیں ہونے دیا جائے گا''۔

وطنِ عزیز میں بے روزگاری بڑھی، کام ملنا محال ہوا، لوگ رزق کے لئے جگہ جگہ خوار ہونے لگے تو آواز آئی، ''مقامِ شکر ہے کہ عام آدمی پر اس کا کچھ زیادہ اثر نہیں پڑا''۔

ریاست میں جلسے جلوس شروع ہوئے، احتجاجی تحریکیں چلیں، عوام نکل آئے، دکانیں جلائی گئیں، لوگوں نے حکومتی رِٹ کو چیلنج کیا تو بلا تردد کہا گیا، ''اس قسم کے ہتھکنڈوں سے نہ تو حکومت کو ڈرایا جاسکتا ہے اور نہ ہی عام آدمی متاثر و بے چین ہوگا''۔

ملک میں آٹا ناپید ہوا، عام آدمی مطمئن؛ چینی مارکیٹ سے غائب ہوگئی یا گھی و خوردنی تیل نایاب ہوا تو عام آدمی بے فکر و بے نیاز، جیسے اس جناتی مخلوق کا ان چیزوں سے کیا واسطہ اور اسے بھلا ان مادی اشیاء کی کیا ضرورت!!! چنانچہ ہر بار یہ حوصلہ افزا رپورٹ حکام بالا اور اربابِ اختیار کو پیش کر دی گئی کہ، ''مافیا کے پیدا کردہ مصنوعی بحران کے باوجود ہمارا عام آدمی بھوکا نہیں سویا، وہ ہر طرح سے محفوظ و مطمئن ہے''۔

خدا جانے کون سی دھات اور کس فارمولے سے بنا ہوا ہے یہ عام آدمی جس پر کسی چیز کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ بھوک کا نہ پیاس کا، بُرے حالات کا نہ ہی بڑھتی ضروریات کا، سختیوں کا نہ مشکلات کا، مصیبتوں کا نہ ہی رنجشوں کا۔ معلوم نہیں کونسی طاقتور مقناطیسی حصار میں بند کر کے اسے ہر قسم کے خطرے سے بچا کے رکھا گیا ہے۔

طرح طرح سے اسے رگڑا گیا، قسم قسم کی آزمائشوں سے اسے گزارا گیا مگر اس سخت جان کے ہونٹوں پہ کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوئی، نہ ہی اس نے کوئی شور یا واویلا مچایا۔ فیض احمد فیض کی افکار سے فیض پاتے ہوئے اس نے اپنا سینہ تمام قسم کے تیروں کے سامنے ڈھال بنائے رکھا گویا دنیا کو پیغام دے رہا ہو کہ؛

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو، کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

لینن سے لے کر کارل مارکس تک، مسولینی سے لے کر نیلسن منڈیلا تک، حالی سے لے کر اقبال تک، فیض سے لے کر فراز تک، جالب سے لے کر احسان دانش تک، سب ہی نے اسے بیداری کے کچوکے لگائے مگر اس نیک بخت کو بیدار نہیں ہونا تھا سو نہیں ہوا۔

بھوک اور فاقے کے عذاب سے اسے بارہا گزارا گیا، تذلیل کے پل صراط پر اسے دوڑایا گیا، بے بسی، بے حسی اور بے مروتی کے متلاطم دریا میں اسے غوطے دئے گئے مگر ملا کیا؟

کچھ نہیں؛ کچھ بھی تو نہیں!!

ہر غم سے بیگانہ اور ہر آفت سے بے خبر!!

اپنے حال میں مست و مطمئن، جیسے اسے کوئی دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں۔

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

فولاد بھی تو ٹوٹ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے!
تانبا و لوہا بھی تو پچک جاتا ہے، زنگ آلودہ ہو جاتا ہے!
سیمنٹ و کنکریٹ بھی تو اکھڑ جاتے ہیں!

مگر اس بے انصاف پر کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ جس طرح چوری چھپے دنیا میں آتا ہے ویسے ہی خاموشی سے گذر بھی جاتا ہے۔ نہ آمد پر کوئی ہلچل و ہنگامہ نہ ہی رخصت ہونے پر کچھ شور و شرابا۔ سائنس اس کے سامنے انگشت بدنداں تو فلسفہ اس کے آگے خاک بہ سر۔ ہر حال میں پرسکون اور ہر قسم کی صورت حال میں قانع، عام آدمی!!!

اسے کبھی سردی لگتی ہے اور نہ ہی گرمی ستاتی ہے۔ جون جولائی کی گرم لُو نے کبھی اس کا کچھ بگاڑا نہ ہی دسمبر جنوری کی یخ بستہ ہواؤں اور برفانی طوفانوں نے اسے کبھی بے چین کیا۔

طاقتور اتنا کہ بڑے بڑے جری اور سورما اس کے حوصلے اور برداشت کے سامنے شکست خوردہ نظر آئیں اور کمزور اتنا کہ معمولی بات پہ آنکھوں سے اشکوں کے سیلاب بہہ نکلیں۔ معصوم اتنا کہ آسانی سے ہر کسی کے فریب میں آئے اور سخی اتنا کہ اپنی شدید ضرورت کی اشیاء بغیر تقاضے کے حاجت مندوں کے حوالے کردے۔

سید محمد جعفری کے الفاظ میں کچھ قطع و ترمیم کے بعد اپنی حالت آپ کہتا ہوا عام آدمی؛

جینے کی کشمکش میں نہ بے کار ڈالئے
میں ''عام آدمی'' ہوں مجھے مار ڈالئے
پھر نام اپنا ''قوم کا معمار'' ڈالئے
جو مجھ کو دے شکست اسے ہار ڈالئے

جس طرح کوئی ریاست ''عام آدمی'' کو خوش اور خاموش رکھنے کے لئے بے چین و بے قرار دکھائی دیتی ہے اسی طرح اس کی ناراضگی سے خوفزدہ بھی رہتی ہے۔ سیاست کے میدان میں فریقِ مخالف (اپوزیشن) جب صاحبانِ اقتدار کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں تو فقرہ اچھالا جاتا ہے، ''ناقص اقدامات کے باعث حکومت عام آدمی کی حمایت سے محروم ہوتی جا رہی ہے''۔ اسی انداز میں جب حکومتی ارکان اپنی مضبوط حکومت کا دعویٰ کرنے لگتے ہیں تو برملا کہہ دیتے ہیں، ''ہمیں عام آدمی کی بھرپور حمایت حاصل ہے لہٰذا اپوزیشن بے جا مخالفت سے باز رہے''۔

اہمیت و فرائض کے لحاظ سے سب سے اوپر تو حقوق میں سب سے پیچھے۔ جمہوری نظام کی مضبوطی کا ذکر ہو تو عام آدمی کو ووٹ کے لئے باہر نکالنے پر زور دیا جاتا ہے۔ معیشت کی استحکام کا سوال ہو تو عام آدمی کو ٹیکس نیٹ میں لانے کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے کے حصول کا معاملہ ہو تو سخت اور ظالمانہ شرائط کا دفاع کرتے ہوئے کہا جاتا ہے، ''ملکی استحکام کی خاطر عام آدمی کو تھوڑی بہت قربانی تو دینی ہی ہوگی (ہمارے دستور میں شاید عام آدمی کی قربانی کا زیادہ تزکرہ ہے جبھی تو اسے ہی بار بار قربانی کا بکرا بنایا جاتا ہے اور اسی ہی کی قربانی واجب بھی سمجھی جاتی ہے؛ امراء اس سعادت سے اکثر محروم ہی رکھے جاتے ہیں)''۔

قومی مفاد میں بار بار قربان ہونے والا عام آدمی جو خود کو بھول کر فقط خودی کو بلند کرنے کا متمنی ہوتا ہے۔ اقبال کی تان پر لہکتا گاتا ہوا عام آدمی۔۔۔۔

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کے سلوں میں
میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اخبار اٹھا کر دیکھا، آج کی بڑی سرخی تھی، ''حکومتِ وقت عام آدمی کے فلاح و بہبود کے لئے بہت سے نئے منصوبے لا رہی ہے؛ ہماری کوشش ہے کہ عام آدمی کو اٹھایا جا سکے''۔ اب خدا جانے عام آدمی کو کہاں اور کیونکر اٹھایا جا رہا ہے۔ پاس ہی تشریف فرما، لالا سمندر خان سے معاملے کی وضاحت چاہی جو اس وقت شغلِ گوشت خوری کے بعد دانتوں کا خلال فرما رہے تھے۔ وہ متفکرانہ انداز میں ہنس کے کہنے لگے، ''اور کتنا اٹھانا ہے ملک صاحب؛ بس ایک اوپر اٹھنے کی کسر ہی تو رہ گئی ہے اب تو۔ بس اب یہ اوپر ہی کو اٹھ جائے تو اس کی مشکلات اور اربابانِ اختیار کے خدشات ختم ہو جائیں؛ شاید اس طرح اس قوم کا کچھ بھلا ہو جائے''۔

''تو لالا! کون ہے یہ عام آدمی؟'' میں نے پوچھا۔

معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوئے، ''حکیم جالینوس کا قول ہے کہ میں اگر ''آواگون'' کا قائل ہوتا تو یہ ضرور کہتا کہ پچھلی جنم کے سرکشوں اور نافرمانوں کو اس جنم میں ''عام آدمی'' کے روپ میں دوبارہ پیدا کیا گیا ہے تاکہ ان کی سزا کا تسلسل برقرار رہے اور یہ گنہگار یہاں بھی سکون و آرام کو ترستے پھریں۔ حیرت ہے تم نہیں جانتے عام آدمی کو؟ بھئی ہر وہ آدمی جو خاص نہیں وہی عام آدمی ہے۔ میں ہوں عام آدمی، تم ہو عام آدمی، دفتر میں کام کرنے والا ہے عام آدمی، بازار میں پاپڑ بیچنے والا، بسوں میں دھکے کھانے والا، صاحب کے حکم پر دوڑ کر پہنچنے والا، نوکری کے لئے جگہ جگہ خوار ہونے والا، میلوں لمبی قطار میں لگ کر آٹا، گھی اور چینی خریدنے والا، لیڈر کے لئے زندہ باد مردہ باد کے نعرے لگانے والا، کھیتوں میں کام کرنے والا، فیکٹری کا مزدور، بسوں میں چورن بیچنے والا، پولیس کے ڈنڈے کھا کر بھی خوش ہونے والا، بھائی یہی تو سب عام آدمی ہیں جن کے لئے حکومت پریشان ہو رہی ہے اور انہیں اوپر اٹھانے کے منصوبے بنا رہی ہے''۔

لالا کے گزارشات سن کر زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے عام آدمی ہونے کا علم ہوا اور نتیجے میں ملنے والا احساس و اطمینان کافی فرحت بخش بھی تھا۔۔۔!!!

نور نہایا رستہ......جلیل عالی

شاعر علی شاعر/کراچی

جب کسی غزل گو شاعر کا نعتیہ شعری مجموعہ زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آتا ہے تو وہ زیادہ توجہ حاصل کرتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اِس طرف سوچا تو محسوس ہوا کہ جو لوگ غزل سے نعت کی طرف آتے ہیں اُن کی نعت کہنہ مشقی اور پختہ پن کی اعلیٰ مثال ہونے کے ساتھ ساتھ اُسلوبِ اظہار کا عمدہ نمونہ ہوتی ہے اور اُس میں ادبیت مکمل طور پر سائی ہوتی ہے۔ اگر ہم کسی عالم، فاضل اور مفتی صاحب کی نعت کا مطالعہ کریں تو اُس میں ہمیں ٹھیٹھ عربی زبان کے الفاظ، شریعت کے حصار میں قید، مذہبی رنگ سے آمیز اور وہ وعظ و نصیحت کا پیکر نظر آتی ہے، یہاں تک کہ اُس میں عروض کے فنی سقم بھی موجود ہوتے ہیں اور اوزان و بحور کا استعمال بھی نظر میں جچتا نہیں، مگر جب ایک غزل گو شاعر کی نعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اُس میں شعریت، غنائیت، روانی، سلاست، فصاحت اور بلاغت کے جلوے مصرع در مصرع اپنی آب و تاب کے ساتھ صف آرا ہوتے ہیں۔

جناب جلیل عالی کی وجہِ شہرت غزل گوئی ہے، مگر اب اُن کا نعتیہ شعری مجموعہ ''نور نہایا رستہ'' منصۂ شہود پر آیا ہے تو نہ صرف قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی ہے بلکہ مشاہیرِ اُردو ادب اور محققینِ نعت بھی اِدھر متوجہ ہوئے ہیں کیوں کہ جناب جلیل عالی کی غزل کی طرح اُن کی نعت بھی مذکورہ بالا تمام صفات و اوصافِ شعری سے مزین ہے۔ نور نہایا رستہ میں اُن کی حمد، نعت، منقبت اور سلام شامل ہیں۔ اِس مجموعے میں نعت، غزل کی ہیئت میں بھی ہے اور نعتیہ نظموں کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ نور نہایا رستہ کو نومبر 2018ء میں حرف اکادمی راولپنڈی نے خوب صورت انداز میں شایع کیا ہے جس کی قیمت کوئی نہیں ہے اور یہ مجموعہ 112 صفحات پر مشتمل ہے۔ مناقب میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، شامل ہیں جب کہ ایک طویل نعت بھی اِس نعتیہ شعری مجموعے کی زینت بنی ہے جس سے اِس کتاب کا نام اخذ کیا گیا ہے...... وہ شعر ملاحظہ ہو:

جہل کے گھور اندھیروں اندر
جگ مگ نور نہایا رستہ

جناب جلیل عالی کی اِس طویل نعت پر معروف شاعر امین راحت چغتائی نے اپنے خیالات کا اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے:

''پروفیسر اُسلوب احمد انصاری فرماتے ہیں کہ: ''حقیقت کا ادراک دو طرح ممکن ہے۔ ایک طرف علم و منطق کے وسیلے سے اور دوسری طرف کشف و وجدان کی روشنی میں۔'' اور جلیل عالی کے بارے میں قیاس ہے کہ اُس پر ''نور نہایا رستہ'' کی طویل نعت بھی کسی ایسی ہی وجدانی کیفیت میں نازل ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ نعت پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کہی نہیں گئی، کہلوائی گئی ہے۔ بارک اللہ!

جلیل عالی ہمارے صاحبِ اُسلوب شاعر ہیں جو اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں فکر و فن کے جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ میاں محمد بخش کے سیف الملوک کی لَے سے خاص رغبت رکھتے ہیں جو اہلِ دل کو لُوٹ لیتا ہے اور جہاں تک عبدہٗ کے مقام کا تعلق ہے اس سے پوری طرح آگاہ ہیں۔ اُنھوں نے اپنے نعتیہ کلام کو ''نور نہایا رستہ'' کا علامتی نام دے کر بھی ربّ العزت سے جھولی بھر بھر خیر و برکات سمیٹ رکھی ہیں۔ بلاشبہ نعتوں کے مجموعے کو ایسا بے مثل نام کسی اور نے آج تک نہیں دیا۔

جلیل عالی کی نعت پڑھتے وقت پروفیسر اُسلوب احمد انصاری ایک بار پھر یاد آئے۔ وہ کہتے ہیں کہ: ''کسی ادبی کارنامے میں اقدار کا ایک نظام، انفرادی تخلیقی تجربہ اور لسانی ڈھانچہ ہونا ضروری ہے۔'' اور زیرِ نظر کلام میں تینوں باتیں موجود ہیں۔ مثلاً مسلّمہ اخلاقی و ادبی عوامل کی مربوط ہیئت پیشِ نظر ہو تو یہ شعر پڑھ لیجیے:

دسترس اُس کی نگاہوں کی کراں تا بہ کراں
وہ تجسس کے لیے آخری منزل کا نشاں

انفرادی تخلیقی تجربہ تو بہ ذاتِ خود ایک مفصل مضمون کا متقاضی ہے، لیکن شعر میں ''سمٹے تو دلِ عاشق، پھیلے تو زمانہ ہے'' کی کیفیت دیکھنا مقصود ہو تو عالی کے یہ شعر ملاحظہ فرمایے:

دنیا کیا تسخیرے مجھ کو
شوق ترا تعمیرے مجھ کو
تیرے دھیان کے اپنے موسم
کیسے وقت اسیرے مجھ کو

درلسانی ڈھانچے میں سلیقہ و قرینہ دیکھنا ہو تو پوری طویل نعت پیش کی جا سکتی ہے جس کا تفصیل سے ذکر آیندہ سطور میں آ رہا ہے، مگر ایک بات طے ہے کہ جلیل عالی کا اُسلوبِ دعا و نعت روایتی استدعا اور اظہارِ عقیدت سے مختلف ہے۔ شاعر کی سوچ اور اُس کے بیان میں ایسا قرینہ ہے جو خلقی طور پر باطن کی ذہن

ہے، لیکن یہ ماجرا بھی عجیب و غریب ہوتا ہے۔ سوچ اندرونی و بیرانی اثرات کے دباؤ سے رفتہ رفتہ نکھرتی رہتی ہے، مگر روح کی بالیدگی سے مشروط ہو کر۔ پھر یہی بالیدگی "خبر" کو "نظر" بنا دیتی ہے اور شاعر کو اظہار کا مختلف ڈھانچہ عطا کر کے اُس سے ایسے اشعار کہلواتی ہے:

منکشف کر سوچ سے پہلے کی بات
لفظ سے آگے رسائی دے مجھے
دل تہوں میں کوئی سرگوشی اُگا
فصلِ صبحِ آشنائی دے مجھے
لامکاں بھی آنکھ پتلی میں کھلے
وہ نگاہِ ماورائی دے مجھے

یوں آرزو اور رنگِ آرزو دونوں بدل جاتے ہیں اور شاعر بڑے قرینے سے عرض پرداز ہوتا ہے کہ تو نے توفیقِ تجسس تو بخش دی، مگر خیرِ عرفانِ حقیقت کی بھی التجا ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ اُسے توفیقِ تجسس جس ہستی کے حوالے سے ملی ہے اُس حوالے سے خالقِ کائنات اُس کے حرکیاتی نظام کی معروضی تفہیم بھی چاہتا ہے۔ یہ نعت کا وہ رنگ ہے جو عصری نعت نگاروں کے حصے میں کم کم آیا ہے۔ عالی مربوط فکر و عمل کے شاعر ہیں اُن کی نعتیہ شاعری گہری بصیرت، مگر سبک الفاظ کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور ایک ایسی فضا تخلیق کرتی ہے جس میں تحرک بھی ہے اور یقینِ محکم بھی۔ نتیجتاً حاصل کا دریوں وا ہوتا ہے:

وہ عشق ہے عرفاں ہے، وہ عقل ہے برہاں ہے
ہر فکر و عمل اُس کا، آئینۂ قرآں ہے
سانسیں ہیں رواں اُس سے، سینے میں اذاں اُس سے
وہ روز و شبِ دل ہے، وہ تاب و تبِ جاں ہے

جلیل عالی کی شعری جمالیات میں بھی ایک انوکھا پن موجود ہے۔ مثلاً دل زمینوں میں صدق و صفا اُگانا، رگِ زارِ حیات کو پھول پھول کرتا تبسم، دیے جلاتی شفیق پلکیں، خبر خساروں کے جنگلوں میں خیر خوشبو، فصلِ صبحِ آشنائی، لامکاں کا آنکھ پتلی میں کھلنا اور نور نہایا رستہ ایسی دل آویز اور رعایتِ لفظی سے آراستہ تراکیبِ فکر و فن دونوں کو ایسا سرور بخشتی ہیں کہ قاری بے اختیار پکار اُٹھتا ہے، "نگاہے! یا رسول اللہ نگاہے!"

جلیل عالی کی نعت میں سرکارِ دو عالم ﷺ سے اظہارِ محبت میں ایک پہلو "شدت" کا بھی ہے جو ایمان کی پختگی اور سوزِ دروں سے عبارت ہے۔ ایمان کی پختگی تو اپنے آپ کو قولاً و فعلاً کلمۂ طیبہ کے سپرد کر دینے کا نام ہے، لیکن سوزِ دروں تو اُس کششِ فیضِ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے جو شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے:

دل شاد ہے ہر درد کی شدت سے زیادہ
کیا چاہیے اور اُس کی محبت سے زیادہ
یہ سچ ہے کہ ہم اُس کی پرستش نہیں کرتے
رہتا ہے مگر دل میں عبادت سے زیادہ

یا:

اسم جس آن ترا لوحِ زباں پر لو دے
سنگ سینے میں پگھل جائیں اَناؤں والے

اِس کو اقبال "جہانِ عشق و مستی" کا نام دیتے ہیں، یہ انجذاب و اتصال کی کیفیت ہے، لیکن اِس کے لیے بھی کہا جا سکتا ہے کہ "پروردگار جس کو یہ نعمت عطا کر دے" الحمدللہ! جلیل عالی اِس کیفیت کی منازل طے کر رہے ہیں۔

اِس پس منظر میں ہم حاصلِ کلام "جگ مگ نور نہایا رستہ" والی نعت کی طرف آتے ہیں جو مناجات کے اُسلوب میں کہیں گئی ہے تو یہاں وہی سوزِ دروں لبِ عجز و نیاز بن گیا ہے۔ قصیدے کی تشبیب والے اُسلوب سے بھی کام لیا گیا ہے۔ یاد کیجیے کہ تشبیب کا لفظی معنیٰ "آگ سلگانا" یا "عشق کا بیان" ہے۔ جلیل عالی کے فن کی خوبی یہ ہے کہ وہ جذبات کی فراوانی میں بھی اپنا لہجہ دھیما رکھتے ہیں اور شعر کو مقامِ اطاعت سے آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ عشق و مستی کے تقاضے اپنی جگہ، مگر اُنھیں احساس ہے کہ حضور ختمی مرتبت شارع علیہ السلام ہیں۔ اُنھوں نے نناوے اشعار کی نعت نما مناجات میں حضور ﷺ کے متعین کردہ رستے کے اتنے پہلو اُجاگر کر دیے ہیں کہ قدم قدم پر فکر و نظر کے چراغ جل اُٹھتے ہیں۔ میاں محمد بخش کے لہجے نے بھی کام کیا ہے۔ جس سے تاحدِ نظر "نعتِ محمد ﷺ والا رستہ" کھلتا چلا جاتا ہے اور شاعر کے ساتھ قاری بھی سراپا التجا بن کر دوہراتا چلا جاتا ہے:

مجھ پر کھول خدایا رستہ
نعتِ محمد ﷺ والا رستہ
جہل کے گھور اندھیروں اندر
جگ مگ نور نہایا رستہ
دُور کرے سب دہر خسارے
خیر و برکت والا رستہ
اُس کے لحن میں چپ صحراؤں
پیار کی بولی والا رستہ

جلیل عالی کی تمام نعتوں کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اُس کا موضوع اجتماعیت سے متصف ہے۔ یعنی:

اُس نے تمام زمانوں خاطر
راتوں جاگ کے سوچا رستہ

اور ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جب وہ وفورِ عقیدت میں کہتا چلا جاتا ہے کہ کیسا رستہ! نعتِ محمد ﷺ والا رستہ! سینوں بیچ بنایا رستہ! شب زاروں میں دمکا رستہ! سیدھا رستہ! سادہ رستہ! اِسی اثنا میں "سیف الملوک کی

ئے'' اُسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وجد کے عالم میں اُس پر نزولِ شعر شروع ہو جاتا ہے:

اللہ! اللہ! آقا! آقاﷺ!
کیسی منزل، کیسا رستہ
اللہ! اللہ! آقا! آقاﷺ!
واحد منزل، تنہا رستہ
اللہ! اللہ! آقا! آقاﷺ!
اپنی منزل، اپنا رستہ
اللہ! اللہ! آقا! آقاﷺ!
منزل منزل، رستہ رستہ
قدم قدم قرباں دل اُس پر
جس کے وسیلے پایا رستہ

ذکرِ کثیر اُفرمانِ خداوندی ہے۔ نقشبندی سلسلے کا وصفِ خاص ہے۔ اُسے تطہیرِ قلب کے لیے پڑھا جاتا ہے اور اُس کا ایک مخصوص ''آہنگ'' ہے۔ اہلِ طریقت ایک دائرے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ دائرہ کائنات کی علامت ہے جسے ذکر کردگار اپنے احاطے میں لے لیتا ہے۔ ذکر کا آغاز آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ پھر تیز اور پھر تیز تر۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک جاری رہتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ''اللہ ھو'' کی ضرب براہِ راست دل پر پڑتی ہے۔ علائق دنیا موقوف ہو گئے ہیں اور ذاکر ہوا کی طرح سبک خرام ہو جاتا ہے۔ وہ ذکر کے اختتام پر بھی ''اللہ ھو'' کی ضرب کچھ دیر تک اپنے دل پر محسوس کرتا رہتا ہے۔ یہ مشق جاری رکھی جائے تو تطہیرِ قلب کا سامان ہو جاتا ہے اور ساری کائنات ''آنکھ پتلی'' میں سما جاتی ہے۔

مذکورہ نعت کے آہنگ میں بھی یہی ''تکنیک'' استعمال کی گئی ہے اور شاید کسی طویل نعت کے ردھم میں یہ ہنروری پہلی بار دیکھنے میں آئی ہے۔

جلیل عالی ہوش سے نعت کہنے والے شاعر ہیں۔ آدابِ رسالتﷺ ہمہ وقت پیشِ نظر رہتے ہیں۔ بارگاہِ رسالتﷺ میں استدعا کے لیے شایانِ شان الفاظ کا انتخاب، آسان و ملائم اُسلوبِ اظہار، عجز وانکسار کا شعار اُن کی نعت کے خصوصی اوصاف ہیں۔ اُن کے مقام آشنا شاعر ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ زیرِ نظر نعت کے اختتام پر بھی کہتے ہیں:

دھول رہوں اُس کے قدموں کی
اور ہے باقی جتنا رستہ

کیا عجب یہی نعت جلیل عالی کا توشۂ آخرت بن جائے۔''

جنابِ جلیل عالی کی نعتیہ شاعری میں والہانہ عقیدت بھی موجود ہے اور حضورِ اکرم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نسبت پر فخر و ناز بھی۔ شاعرِ موصوف نے نعت کی تخلیق میں عام اور سرسری سے انداز کو ترک کیا ہے۔ تمام تر توجہ، لگن اور جستجو کو یک جا کر کے نعت تخلیق کی ہے۔ اُنھوں نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات گنوائے ہیں جو خدائے بزرگ و برتر نے اُنھیں عطا کیے ہیں۔

جلیل عالی کہتے ہیں کہ خدا نے رسولِ آخرﷺ کو دو جہاں کی بادشاہی سونپنے کے ساتھ ساتھ اُن کے دل پر دو جہاں کے اسرار بھی منکشف کر دیے۔ خیر کے سارے معیار آپ کی سیرت سے اُبھرے ہیں، شہرِ نبویﷺ مدینۂ منورہ میں چاک دلوں کی بخیہ گری ہوتی ہے اور اسی لہر سے دنیا کے سارے بیڑے پار لگتے ہیں۔ خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بزمِ شعور و شوق کے شاہ کار ہیں۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسمِ گرامی اکسیرِ عالم ہے جس سے جسم و روح کے تمام آزار دور ہو جاتے ہیں۔ تمام خستہ تنوں کی وہی دست گیری کرتے ہیں اور تمام لاچار، مفلس و نادار اُنھی کی طرف دیکھتے ہیں، اُنھی سے آس لگاتے ہیں۔ زمانہ جب اُن کی پیروی کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو قدرت اُس کے لیے تمام راستے خود بہ خود ہموار کر دیتی ہے۔ اُن ہی کے سایۂ رحمت میں ہمارے جسم و جاں ہیں اور اُنھی سے ہم آباد و خوش حال ہیں، میری سوچ میں اُن کا شوق ستارے ٹانکتا ہے اور میرے سارے اظہار اُنھی کے نام ہیں۔ صدیاں گزر گئیں، مگر ہر ہر چیز اُن کو یاد کرتی ہے، چاہے وہ حرا ہو یا منیٰ، جس جس چیز کو آپ سے نسبت ہے اُس نے آپ کو راہ نما بنایا ہوا ہے۔ زمین و آسمان میں ایک شخص بھی تیری ہم سری نہیں کر سکتا کیوں کہ دنیا کے ہر شخص نے خدا کی عظمت کے بعد اُن کو عظیم کہا ہے۔ عالمِ اسلام میں جو بھی مومن و مسلمان مصائب میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ تیری درد مندیاں یاد کرتا ہے اور ابتلا میں تمام مسلمانانِ عالمِ اسلام کے دل تجھی کو صدا دیتے ہیں۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عزم ایسا اثر نواز ہوا کہ دشمن کے تمام لشکر ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے اور تیرے قرب و جوار میں فقط تیرے ہم نوا اور شیدا رہ گئے۔ جس نے تیرا کلمہ پڑھا اُسے دونوں جہان کی خوش نصیبی مل گئی اور جس نے تجھے بھلا دیا وہ شخص بالآخر اپنی نظر سے بھی گر گیا۔ میرے پیارے آقاﷺ یہ بھی تیرا اعجاز ہے کہ دنیا و جہان میں سب سے زیادہ تیری تعریف کی گئی ہے، سب سے زیادہ تجھے لکھا گیا ہے، سب سے زیادہ تجھے پڑھا گیا ہے، سب سے زیادہ تجھ پر اور تیری آل پر درود و سلام بھیجا گیا ہے، یہ منظوم اظہار دیکھیے۔

اتنا کسے لکھا گیا، اتنا کسے پڑھا گیا
جتنا لکھا گیا تجھے، جتنا پڑھا گیا تجھے

سبحان اللہ...... مذکورہ بالا شعر کی تفسیر و تشریح میں دفتر کے دفتر لکھا جا سکتے ہیں اور اس شعر کی جس

قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ جس طرح غالبؔ نے مومنؔ کے اِس شعر:

وہ میرے پاس ہوتے ہیں گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پر کہاں تھا کہ مومنؔ کے شعر کے بدلے میں اپنا دیوان دینے کو تیار ہوں۔ اِس میں کوئی مبالغہ آرائی یا بناوٹ و دکھاوٹ نہیں کہ میں بھی جناب جلیل عالی کی خدمت میں یہ پیش کش کرتا ہوں کہ میں اُن کے اِس شعر کے بدلے اپنی پوری کلیاتِ حمد و نعت ''نور سے نور تک'' دینے کو تیار ہوں۔ جناب جلیل عالی کا یہ شعر اپنی مثال آپ اور اپنا جواب آپ ہے۔ اِس شعر میں محمد ﷺ کے مفاہیم بھی قلم بند ہیں اور احمد کے معانی بھی سمو دیئے گئے ہیں۔ قرآنِ مجید فرقانِ حمید کی ورفعنا لک ذکرک کی آیت کی تفسیر بھی موجود ہے اور اللہ رب العزت کی نسبت بھی کہ (میں بھی نبی پر درود بھیجتا ہوں، اے ایمان والو تم بھی اُن پر درود و سلام بھیجو) اِس شعر میں مزین ہے۔ یہ شعر کتنا پُر مغز اور گہری معنویت کا حامل ہے، اگر جلیل عالی کو اس شعر کا الہام والقا ہو جاتا تو شاہد وہ اِسی پر اِکتفا کرتے۔

کہتے ہیں جس شخص سے محبت و عقیدت ہو جاتی ہے اُس سے نسبت رکھنے والی ہر چیز پیاری لگنے لگتی ہے۔ اُس شخص کے ہر عمل اور ہر حکم سے محبت و عقیدت کرنے والے شخص کی روح بندھ جاتی ہے۔ یہ ایک فطری عمل بھی ہے اور نفسیاتی محرک بھی، لہٰذا ہر مسلمان حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنی ذات، اولاد، ماں باپ اور مال و جائیداد سے بڑھ کر محبت کرتا ہے، لہٰذا اُن سے نسبت رکھنے والی ہر شے سے اُنسیت پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ مدینہ کہنے کو تو ایک شہر ہے، مگر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نسبت ہونے کی وجہ سے ہر مسلمان کی آنکھوں کا تارا بن گیا ہے اور اُس کے دیدار کی آرزو اور تمنا میں مسلمانانِ عالمِ اسلام دن رات تڑپتے ہیں اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری کے لیے بے چین و مضطرب نظر آتے ہیں۔ اِن تمام پاکیزہ جذبات اور احساسات کا اظہار جناب جلیل عالی کی شاعری میں یک جا نظر آتا ہے۔ محبت و عقیدتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجسم ہو کر اُن کے اشعار کی صورت ہمارے سامنے آجاتی ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ منزلتِ نبی ﷺ کی اطاعت و تقلید پر اُن کا دل دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جناب جلیل عالی کی انھی نعت گوئی کی صفات سے متاثر ہو کر جناب محمد حمید شاہد نے اپنی رائے کا مثبت اظہار اِن الفاظ میں کیا ہے:

''بجا کہ نعت کا لفظ قرآنِ پاک میں نہیں ہے اور نہ ہی احادیث کی اُمہاتِ کتب میں، یہ اپنے تخصیصی معنی میں آیا ہے، تاہم نعت کی اساس قرآن و حدیث ہی ہے۔ عربی سے فارسی میں پہنچ کر یہ لفظ مطلق ثنائے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مخصوص ہوا اور یہیں سے اُردو میں مروج ہوا۔ کہنے کو نعت کا موضوع طے ہو چکا ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اِس میں موضوع کی وسعت اور عظمت ایسی ہے کہ وہ اپنی تاثیر کے ساتھ توفیقِ الٰہی اور جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عشق ہی سے کسی کو عطا ہوتی ہے۔ یہ توفیق جلیل عالی کو عطا ہوئی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ کئی سال پہلے جب جلیل عالی کا پہلا شعری مجموعہ ''خواب دریچہ'' منظرِ عام پر آیا تو اِس کے ابتدائی صفحات میں جو نعت موجود تھی، وہ بھی اپنے مزاج کے اعتبار سے الگ دھج رکھتی تھی:

ایک لمحہ کہ ملیں سارے زمانے جس میں
ایک نکتہ کہ سبھی حکمت کے خزانے جس میں
دائرہ جس میں سما جائیں جہانوں کی حدود
آئنہ جس میں نظر آئے عدم کا بھی وجود
فرش پر عرش کی عظمت کی دلیلِ محکم
خلق پر رحمتِ خالق کی سبیلِ محکم
دسترس اُس کی نگاہوں کی کراں تا بہ کراں
وہ تجسس کے لیے آخری منزل کا نشاں
ایک توسیع جو قسمت کی لکیروں میں رہے
ایک تنبیہ جو بیدار ضمیروں میں رہے

صاحب! میں نے تو اِس پہلی نعت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ جلیل عالی پیشہ ور نعت نگاروں، اتفاقاً یا شوقیہ اِس طرف آنکلنے والوں اور موقع کی مناسبت سے دیگر موضوعات کی طرح نعت کہہ لینے والوں جیسے نہیں ہیں۔ اُن کا تخلیقی عمل اپنی مختلف سطوح میں ایک ایسے تصورِ جمال کی عطا ہے جسے پیکرِ جمیل نبیِ آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ سے الگ کر کے دیکھا جا سکتا ہے نہ اُس نظام سے الگ کر کے جس کے وہ داعی تھے۔ ہمارے اِس محبوب شاعر کے ہاں لطیف جمال کے شوق دھارے سے جس مثالی انسان کا خاکہ بنتا ہے یا پھر اُس انسان کے لیے جا بہ جا ایک دردمندی سے سلامتی کی جو راہیں تجویز ہوتی ہیں وہ اُن کے کلام میں ایک مربوط فکری جہت اور اُس میں موجزن بصیرت کے خد و خال کی تعیین بھی کر دیتی ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا:

''جلیل عالی نے اپنے ''دل کی لوح پر سچائی کا اسم روشن'' کر رکھا ہے۔ یہ اُس کے اپنے الفاظ ہیں، مگر خود ستائی سے مبرا، اس لیے سچے اور دیانت دارانہ ہیں۔''

یہیں عالی صاحب کی نعت کا ایک شعر یاد آتا ہے:

ہم کو دیتا ہے وہی اسم پناہیں عالیؔ
ورنہ اس بحرِ گماں میں جو بھنور بنتے ہیں

قاسمی صاحب کا کہا اور عالی صاحب کی نعت کا شعر مجھے یوں ایک ساتھ یاد آئے ہیں کہ انھی میں بہ جا طور پر عالی صاحب کے تخلیقی عمل کے محرکات اور سرد کار دونوں نشان زد ہو رہے ہیں۔ جی، میں صاف لفظوں میں کہہ دیتا ہوں کہ عالی کے دل کی لوح پر سچائی کا جو اسم روشن ہے اُس کی مجسم صورت پیکرِ جمیل و جمال صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور یہ کہ عالی صاحب کی رگوں میں دوڑتے عشق کا لہو جہاں تخلیقی محرک بنتا ہے وہیں اُن کے کل کلام کا قبلہ اور اُسلوب بھی متعین کر رہا ہے۔ ''خواب دریچہ'' ہی سے غزل کا ایک شعر:

اب اور تو کچھ ایسے آثار نہیں ملتے
اک شوق ترا اپنے ہونے کی نشانی ہے

زیرِ نظر مجموعے کی ایک نعت سے مقتبس کرتا ہوں:

دنیا کیا تسخیرے مجھ کو
شوق ترا تعمیرے مجھ کو
تیرے دھیان کے اپنے موسم
کیسے وقت اسیرے مجھ کو

جلیل عالی، نہ صرف خود ایک نور نہائے راستے پر چلتے رہنا چاہتے ہیں بلکہ اسی مسافت کی اُجلی دُھول کے اُس پار انسانیت کی بقا کی منزل کو بھی دیکھ رہے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ ماضی کی ہر روشن روایت پر ملبا ہو کر گرتے حال اور کسی مربوط فکری نظام سے عاری کل کے خواب کے اسیر نہیں ہوتے، وہ جس راہ پر ہیں اُس راہ پر پڑنے والا ہر قدم اُنھیں منزل کی تعمیر کا سا لگتا ہے۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ نعت گوئی آسان بھی ہے اور مشکل ترین بھی تو یہ یوں درست ہے کہ ہم ایسے نعت نگاروں کو تواتر سے پڑھتے سنتے رہتے ہیں جو نعت کہتے کہتے جانے اَن جانے میں مبالغے کے ایسے قرینے برتنے لگتے ہیں جو حمد سے مختص ہیں یا پھر دوسری حد کی طرف یوں جست لگاتے ہیں کہ اس باب کے لیے مخصوص ادب کے قرینے کی حد پھاند جاتے ہیں۔ ہوشیار اور محتاط ہوئے بغیر مبالغے کو سہولت سے برتنا یا حدِ ادب کے اندر رہنے کی مشکلات کو سمجھے بغیر کہے چلے جانے والے شاعر چاہے جتنے بھی با کمال ہوں، اِس علاقے میں لائقِ اعتنا نہیں رہتے۔ وہ جو کہتے ہیں با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار، تو یوں ہے کہ جلیل عالی اِس باب میں اِسی مسلک کے امیں ہیں اور اِس راہ کی مشکلات اور نزاکتوں سے بہ خوبی آگاہ ہیں:

لفظ جو نعت کے شایاں ہوں لغاتوں میں کہاں
زہے قسمت کہ سخن عرض رساں ہو جائے

جلیل عالی یوں عالی بخت ہیں کہ اُن کے اخلاص نے اُن پر یہ کٹھن راہی سہل کر دی ہے۔ تخلیقی عمل کے سارے سفر میں قسمت اُن پر کچھ اِس طور مہربان رہی ہے کہ اس صنف کے سارے لوازمات اور متقضیات پورے ہوتے رہے ہیں:

اِک سایۂ رحمت ہے شب و روز سروں پر
یوں ہی تو کٹھن مرحلے آساں نہیں ہوتے
بے ربطیِ افکار میں تالیف کی صورت
بس اِک تیری سیرت کا حوالہ مرے آقا ﷺ

....

دل غزل وادی کا شہزادہ ہے کن حرفوں کہیں
کیا سکوں دیتی ہے اک اک ساعتِ مدحت ہمیں

درست کہ نعت کا لفظ خلقتاً عمدہ صفات کے مالک کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی درست کہ نعت کی صنف کا مرکزی موضوع مدحِ رسول ﷺ ہے، تاہم اب موضوعات کا دائرہ پھیل کر ہر نوع کے مسائل اور مشکلات کو اپنے کلاوے میں لے آیا ہے۔ جدید انسان کے اپنے مسائل اور اپنی مشکلات ہیں اور نئے وقت کے اپنے تقاضے اور اپنے مطالبے ہیں۔ جلیل عالی کی نعت میں آج کی مشکلات سے جھوجھتا اور اپنے وقت کے جبر کی زنجیروں میں جھولتا تڑپتا یہ انسان بھی اپنی پوری شباہت دکھا رہا ہے:

رنگوں کے تعاقب میں نکل جاتے حدوں سے
عکس اُس کے نگاہوں میں جو رخشاں نہیں ہوتے

....

وہ دشتِ احساس میں
بھٹکتے تلاش لمحوں کو
منزلوں کا سراغ دیتے
نقوشِ پا کے چمکتے پرچم

....

خیال خاروں
خبر خساروں کے جنگلوں میں
وہ خیر خوشیوں کے
جاگتے راستے بناتی ہوئی بصیرت

یہیں اِس مجموعے کی اُس حمدیہ نظم کی طرف دھیان چلا گیا ہے جس کا عنوان ''کوئی چراغ سعادت'' ہے:

نظر کی راہ میں
سوالِ التباس رقص کناں
ہزار ابرِ تحیر طراز
برق فشاں
قدم قدم
سرِ احساس ڈولتی سوچیں
شعورِ بے سر و ساماں
گمانِ تیرہ جبیں
کوئی حدیثِ بصیرت
بہ گوشِ زخمِ جگر!
کوئی چراغِ سعادت
بہ طاقِ قلبِ حزیں!

میں مکرر اور بہ اصرار یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جلیل عالی اپنے پورے تہذیبی شعور کے ساتھ عصری حسیّت

کے ساتھ جڑے ہوئے شاعر ہیں۔ وہ اِس عصر میں زندہ ہیں اور پورے تخلیقی وجود کے ساتھ زندہ ہیں۔ وہ رواں وقت کی ایک ایک لرزش کو اپنے وجود پر محسوس کرتے ہیں اور مستقبل کی چاپ سن کر درست درست آنک سکتے ہیں کہ اگلا قدم کہاں دھرنا مناسب ہوگا۔ اپنی اِن توفیقات کے ساتھ وہ ایسے زمانے میں نعت کہہ رہے ہیں کہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر شب و روز ایک ایسا تماشا ہماری نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے جو انسانیت کے شایانِ شان نہیں ہے۔ جلیل عالی یہ سب دیکھ کر اور پریشان ہو کر الگ تھلگ بیٹھ نہیں جاتے، اپنا قلم تھامتے ہیں اور ’’قلبیہ‘‘ کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھ دیتے ہیں۔ اِس ’’قلبیہ‘‘ کا پہلا حصہ حمدیہ ہے اور آخری حصہ نعتیہ۔ نعتیہ نظم پارچے کو لکھتے ہوئے وہ عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبے ہوئے ہیں اور اِس فکری اور تہذیبی نظام سے جڑے ہوئے بھی ہیں جس سے جڑ کر وہ زرِ عرفان پاتے رہے ہیں۔ اِس نظم میں آپ کی رحمتوں کا بیان کرتے کرتے وہ خوش امکانی تحریکوں کی بات کرنے لگتے ہیں۔ اس نظم پر بات کرتے ہوئے میں نے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ میں کسی خوش گمانی میں نہیں ہوں، سوچتا ہوں اور اپنے آپ سے کئی سوال کرتا ہوں، خود سے اُلجھتا ہوں اور ’’خوش امکان تحریکوں‘‘ کے آگے بڑا سوالیہ نشان لگا دیتا ہوں۔ میری طرح اور بھی اُلجھتے ہوں گے، مگر شاعر کے پاس یقین کی دولت ہے اور میں حیران ہوتا ہوں اور رشک کرتا ہوں کہ اس بے مہر زمانے میں بھی اس نایاب دولت سے اُس کا دامن بھرا ہوا ہے۔ اِس خوب صورت نعتیہ اظہاریے میں جذب و شوق کا دریا کچھ اِس صورت کناروں سے چھلکتا ہے کہ شاعر کا دل اُس کے سینے کے بکسے میں نہیں، اُس کی آنکھوں میں دھڑکنے لگتا ہے۔

اس مجموعے کی بیشتر نعتیں ایسی ہیں کہ شاعر کا دل سینے کے بکسے سے باہر نکل کر دھڑکتا اور آنکھوں سے باہر چھلکتا ہے:

دلشاد ہیں ہر درد کی شدت سے زیادہ
کیا چاہیے اور اُس کی محبت سے زیادہ
یہ سچ ہے کہ ہم اُس کی پرستش نہیں کرتے
رہتا ہے مگر دل میں عبادت سے زیادہ

....

دھول رہوں اُس کے قدموں کی
اور ہے باقی جتنا رستہ

صاحب! جلیل عالی جس راستے کی دھول ہیں اور رہنا چاہتے ہیں وہ نور نہایا رستہ ہے اور مجھے آخر میں دہرا لینے دیجیے کہ اُنھوں نے اپنے دل کی لوح پر انتہائی دیانت داری اور سچائی سے ایک روشن اسم سجا رکھا ہے، یہی وہ مبارک اسم ہے جس نے اُن کے تخلیقی مزاج کو الگ چھب اور شناخت عطا کی ہے۔ نعت کہتے ہوئے وہ یوں مختلف ہو جاتے ہیں کہ یہی بنیادی اور مرکزی حوالہ معنیاتی سطح پر کچھ زیادہ روشن اور شفاف ہو کر اپنی جمالیات بھی متشکل کر لیتا ہے، یوں کہ پڑھتے ہوئے قاری کا دل، شاعر ہی کے لفظوں میں سینے کے بکسے میں نہیں رہتا، آنکھوں میں دھڑکنے لگتا ہے۔‘‘

جلیل عالی کی نعتوں میں خوب صورت تشبیہات بھی ہیں اور مؤثر استعارات بھی، شہرِ مدینہ میں حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسبت سے انوار و تجلیات کی بارشیں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں اُن کے نعتیہ اشعار اظہارِ محبت اور والہانہ عقیدت کے صاف و شفاف آئینے ہیں، اور اس فضا میں شاعر موصوف دنیائے تجلیات میں خود کو محسوس کرتے ہیں، لیکن اُن کی خوبی یہ بھی ہے کہ اُنھوں نے اپنے ہر انفرادی احساس کو اجتماعیت کی شکل سے منظوم کیا ہے، اس لیے اُن کی شاعری ہر عاشقِ رسول کے دل کی آواز اور ہر زبان کی پکار بن گئی ہے۔ اُن کی نعت کا ہر شعر فکر و خیال میں ایسا ڈوبا ہوتا ہے اور ایسے معانی و مفاہیم کے تاثرات لیے ہوتا ہے کہ دل کی دھڑکن بن جانے کی صفت سے متصف ہو جاتا ہے۔ جلیل عالی کی نعتوں میں ایک جذبہ خاص طور پر گردش کرتا نظر آتا ہے اور وہ ہے اُن سے نسبتِ خاص، اِس جذبے کی روحانیت، حقانیت اور پاکیزگی کے سبب اُن کی نعتوں میں محبت و عقیدت کی کشش در آئی ہے جو ایمان اور ایقان کو اپنی جانب کھینچ رہی ہے۔ نعت کہہ کر جلیل عالی کو جو قلبی اطمینان اور روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے اُس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو عقیدت و محبت کے اِن مراحل سے گزرا ہو۔ حضور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایمان و ایقان کے اعتبار سے ہر مسلمان کے سب سے زیادہ قریب ہیں اور یہ ایک نفسیاتی علاج بھی ہے کہ انسان اُسی شخص سے اپنا حالِ دل اور اپنی مصیبت کا ذکر کرتا ہے جو اُس کے سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جو اُسے سچا ہم درد اور مونس و غم خوار نظر آتا ہے۔ لہٰذا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زیادہ مونس و غم خوار اور ہم درد دنیا کا کوئی شخص نہیں ہے۔ اسی لیے جلیل عالی نے بھی مونس و غم خوار، احمد مختار، صاحب کردار، پیکر انوار، سید ابرار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنا غم بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا ہے۔ اُنھی سے مدد طلب کی ہے، اُنھی کی راہ نمائی چاہی ہے اُنھی کی رہبری میں چلنا سیکھا ہے اور آج تک اُنھی کی پیروی کر رہے ہیں۔

’’نور نہایا رستہ‘‘ والہانہ عقیدت، پاکیزہ محبت اور حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت کا منظوم و مجسم پیکر اپنی تابانی، آب و تاب اور روحانی شاعری سے ایک عالم کو تادیر منور رکھے گا۔

صاحب و سائیں

شاکر کنڈان/راولپنڈی

لفظ حُسن جب بھی کہیں لکھا ہوا نظروں کے سامنے آتا ہے تو نگہِ دل نواسۂ رسول حضرت امام حسنؑ پر جاٹھہرتی ہے اور دل ونگاہ دونوں لحہ بھر کو احترام میں جھک جاتے ہیں اور اگر عباسی کہیں لکھا ہوا آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو یہی کیفیت ہوتی ہے اور چشمِ دروں آقائے نامدارﷺ کے چچا حضرت عباسؓ کے حضور میں جاٹھہرتی ہے۔ مسلمانوں میں جب کسی با شعور شخص کا نام ان دونوں الفاظ کے مرکب سے ترتیب پایا ہو تو اس میں یہ احساس ضرور اجاگر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے شعور کو کس نقطے پر مرکوز کرنا ہے۔ اس حقیقت سے شعر و سخن کا قاری اس وقت آشنا ہوتا ہے جب اس کے سامنے ''سائیں'' اور ''صاحب'' جیسے شعری مجموعے ورق در ورق کھلتے ہیں۔ یہ دونوں شعری مجموعے حسن اور عباسی کے مرکب سے تہذیب دیئے گئے نام کے شاعر حسن عباسی کے ہیں۔ ان دونوں کا موضوع اللہ تعالیٰ کی ثناو توصیف یعنی حمد ہے۔ جسے ہم زبان کھولتے ہی تتلاتی زبان میں ''الحمدللہ'' کے متبرک الفاظ سے دل کے ہر گوشے، نظروں کی گہرائی اور ذہن کے ہر خلیے میں جذب کر لیتے ہیں اور روح میں سمو کر اسے زندگی کا ورد بنا لیتے ہیں۔

اللہ ربّ العزت نے اپنی حمد سے اپنی آخری مخلوق انسان تک میں ان گنت چیزوں کا قصوں کا، اپنی رحمتوں کا، اپنی برکتوں کا، اپنی کتابوں کا، اپنے پیغمبروں کا، حتیٰ کہ تمام جہانوں، تمام دنیاؤں، تمام مخلوقات اور اپنی دیکھی، ان دیکھی، ظاہر و باطن پوری کائنات کا علم دیا لیکن حسن عباسی نے سائیں سے صاحب تک کے سفر میں حمد کے مختلف موضوعات پر قلم آزمائی کی۔ صاف ظاہر ہے ایک انسان وحدہٗ لا شریک کی عطا کردہ نعمتوں میں سے کسی ایک آدھ صلاحیت کا ہی اظہار کر سکتا۔ بل کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمارے سامنے ہے کہ ''روئے زمین کے (تمام) درختوں کی اگر قلمیں ہو جائیں اور تمام سمندروں کی سیاہی ہو اور ان کے بعد سات سمندر اور ہوں تا ہم اللہ کے کلمات ختم نہیں ہو سکتے۔ بے شک اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے۔'' (سورۃ لقمان) لہٰذا سمندروں میں سے ایک قطرہ سے بھی کم علم رکھنے والا انسان اگر اُس کی توصیف وثنا میں ''سائیں'' اور ''صاحب'' جتنا حصہ ڈالتا ہے تو یہ بھی اُس پاک پروردگار کی رحمت ہے۔ اور صاف ظاہر ہے کہ حسن عباسی نے بھی یہ اکھر شکر ادا کرنے کے حوالے سے ہی کہے ہیں۔

''سائیں'' اور ''صاحب'' دونوں شعری مجموعے اگر چہ پڑھنے سے حمدیہ کلام لگتا ہے۔ لیکن حمد وہ منزل ہے جو شروع میں دکھائی تو دیتی ہے اور ہم ابتدا بھی اسی سے کرتے ہیں لیکن جب اس کی جستجو میں نکلتے ہیں تو ہمیں والناس سے الحمد کی طرف چلنا پڑتا ہے یوں یہ منزل جو کہیں آخر میں آتی ہے اس کا پانا ناممکنات میں سے ہو جاتا ہے۔

آپ کا اسم آخری منزل
اسم پہلا سٹاپ ہے صاحب

یہیں آدمی کو اس سچائی سے واسطہ پڑتا ہے کہ

میں نہیں ہوں کہیں نہیں ہوں میں
آپ ہی آپ، آپ ہے صاحب
کیسے خود کو دکھائی دیتا میں
ہر جگہ تھا قیام صاحب کا

ہمارے ہاں تصوف میں فنا فی اللہ کی اصطلاح اس منزل کے حصول کی ہے لیکن کتنی ایسی ہستیاں ہیں جو فنا فی اللہ کی منزل تک پہنچی ہیں۔ یہاں تو حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو کہہ دیا جاتا ہے کہ ''تم مجھے نہیں دیکھ سکتے'' اور ضد پر وہ صرف ایک تجلی کی تاب بھی نہیں لا سکتے۔ آپ تو آپ وہ پہاڑ جس پر آپ مقیم تھے وہ بھی اس ایک جھلک کی تاب نہ لا سکا۔

آنکھ اس کو پہن نہیں سکتی
اشک کا اور ناپ ہے صاحب

تصوف میں اکثر وحدۃ الوجود کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ ذکر تو ہم بڑی آسانی سے کر لیتے ہیں لیکن یہ فلسفہ اتنا گہرا ہے کہ تہہ کو پانا ناممکنات میں سے ہے۔ ابنِ عربی کی ''فتوحاتِ مکیہ'' سے لے کر علامہ محمد فضل حق خیر آبادی کی ''الرّوض المجود'' یا اسکے بعد بھی اس موضوع پر جو کتابیں تصنیف ہوئیں وہ قاری کو مرعوب تو کرتی ہیں مرغوبیت کی طرف لانے میں ناکام رہتی ہیں۔ دراصل ان تحریروں میں فلسفۂ وحدت الوجود کو پیش کرتے ہوئے اتنا الجھا دیا گیا ہے کہ وہ ادراک سے بالا رہا۔ مزید یہ کہ اسے مکمل طور پر سمجھنا بھی ناممکن ہے چہ جائے کہ سمجھانے کی کوشش کی جائے۔ تصوف کا یہ سفر مجاز سے شروع ہوتا ہے اور حقیقت اس کی منزل ہوتی ہے لیکن آدمی مجاز میں ہی اس قدر کھو جاتا ہے کہ حقیقت تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس سفر میں اگر راستہ صحیح بھی مل جائے تو ایک منزل کے بعد دوسری منزل اور پھر منزل در منزل آدمی تلاش و جستجو کا مسافر ہی رہتا ہے اور وہ القایا من تو شدم تو من شدی کے مقام کو پانے میں ناکام رہتا ہے۔ یہ مقام اُسی کو ملتا ہے جو محبت کے بعد عشق اور عشق کے بعد جنون کے گلے جا ملتا ہے تب کہیں ایک امید بندھتی ہے۔ حسن عباسی بھی ایک ایسا ہی راہی ہے جس نے حقیقت کی

منزل کو تلاشنے کا سفر شروع کر دیا ہے۔اور سائیں اور صاحب دو مجموعے استعاراتی اور علامتی انداز میں اپنی محبت کے اظہار کے لئے پیش کر دیئے ہیں۔اس کا اللہ تعالیٰ سے اس رنگ میں محبت کرنا کئی اشعار میں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور کے اس مجذوب چرواہے کی یاد دلا دیتا ہے جو کہتا تھا:

''اے میرے مالک! تو میرے پاس ہوتو میں تیری خدمت کیا کروں۔تیری جوئیں نکالوں۔تیرا سر دھوؤں تیرے سر میں کنگھی کروں۔تیرے سر میں تیل لگاؤں۔رات کو سوتے وقت تیرے پاؤں دباؤں۔ تیرے سونے کی جگہ کی صفائی کروں۔تیرے کپڑے دھوؤں۔تجھے وقت پر دودھ پیش کروں اگر تو بیمار ہو تو تیرا غم خوار بنوں اگر تیرا گھر دیکھ لوں تو صبح و شام تیرے دروازے پر دودھ اور گھی لے کر آؤں۔اے میرے سوہنے اللہ بکریوں کو تو ادھر اُدھر پھرانے کا محض ایک بہانہ ہے میں تو تیری محبت میں تیری تلاش میں مارا مارا پھرتا رہتا ہوں''

اگر چہ یہ باتیں حضرت موسیٰ کو اچھی نہیں لگیں اور اس چرواہے کو ڈانٹ دیا لیکن اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آئیں کہ کلیم اللہ کو واپس اس چرواہے کو منانے کیلئے بھیج دیا۔

وہاں لہجہ لاعلمی والا تھا یہاں لہجے میں شکایت کا رنگ آ گیا ہے۔اُس دور کے اپنے تقاضے تھے اس دور کے اپنے تقاضے ہیں شاید یہی وجہ ہے کہ لہجے میں تبدیلی آگئی ہے اور اُس محبت نے کچھ ایسا رنگ اختیار کر لیا ہے:

تیرے پہرے میں کیوں میرا
دل ہو جائے چوری سائیں
تیرے جھکڑ چلتے ہیں جب
گر جاتی ہے جھگی سائیں
روز کچل کر گزرے ہم کو
تیری شاہی سواری سائیں
تیرے مجاور لے جاتے ہیں
میری آدھی روٹی سائیں

اور پھر جب حضرت موسیٰ اُس مجذوب چرواہے کو منانے کے لئے واپس اُس کے پاس آتے تو مجذوب کا دل ٹوٹ چکا ہوتا ہے اور وہ افسردگی کے عالم میں ہے لیکن اُسے کیا معلوم کہ اس کے درجات کتنے بلند ہو چکے ہیں۔سو حسن عباسی جب کہتا ہے:

میری مرضی کوئی نہیں ہے
اچھا تیری مرضی سائیں
خود ہی بولنا میری طرف سے
مجھ سے بات نہ ہوگی سائیں

تو ان لفظوں میں بھی وہی معصومیت جھلکتی نظر آتی ہے۔واقعی اللہ رب العزت نے ہر شخص کی فطرت الگ بنائی ہے اور ایک دوسرے سے جدا عقل سے نوازا ہے۔لہٰذا ان کے سوچنے اور اظہار کا طریقہ بھی مختلف ہے:

ملتِ عشق از ہمہ ملت جدا ست
عاشقاں را مذہب و ملت خدا ست

''سائیں'' اور ''صاحب'' دونوں حمد یہ مجموعے ہیں۔دونوں کا مقصد اور مطلب ایک ہی ہے۔دونوں ہی سائیں وصاحب کی عطا کا نتیجہ ہیں اور اکثر اشعار کا اظہار یہ ایک ہی ہے لیکن کہیں کہیں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں کا ظاہر ایک ہونے کے باوجود باطن کہیں کہیں مختلف ہے۔سائیں کا داخل طلب، خواہش، آرزو اور محبت بھرے شکوے ہے جب کہ صاحب کا باطن توصیف، ثنا، تعریف اور ستائش ہے۔اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ صاحب کو پہلے شائع ہونا چاہیے تھا اور سائیں کو بعد میں ہماری تہذیب بھی ہمیں یہی سکھاتی ہے کہ مانگتے ہوئے، طلب کرتے ہوئے، خواہش کا اظہار کرتے ہوئے پہلے کچھ تمہیدی کلمات کہے جاتے ہیں جو عام طور پر اُس ہستی کی تعریف میں ہوتے ہیں اور بعد میں اپنا مدعا بیان کیا جاتا ہے۔یہی سلیقہ ہمیں ذاتِ باری تعالیٰ نے بھی اپنے کلام پاک کے ابتدائیہ میں درس دیا ہے کہ:

''اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحم فرمانے والا ہے۔سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو سب جہانوں کا پالنے والا ہے۔ بڑا مہربان نہایت رحم والا۔جزا کے دن کا مالک۔ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھا راستہ دکھا۔ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے اپنا اکرام کیا، نہ کہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ وہ جو گمراہ ہوئے۔''

اس سورت کو اگر بغور دیکھیں تو ابتدا اپنے اسم ذاتی اور اسمائے صفاتی سے کرنے کے بعد اگلی تین آیات میں توصیفی کلمات اور شانِ ربوبیت پیش کی گئی ہے۔اس سے اگلی آیت میں تھوڑا سا رخ تبدیل کیا گیا ہے اور پھر دعا کا انداز اپنایا گیا ہے۔صاف ظاہر ہے کہ اس کی ضرورت اللہ تعالیٰ کی ذات کو تو نہیں تھی۔ یہ آیات نازل فرمانے کا مقصد ہمیں تہذیب، سلیقہ اور قرینہ سکھانا تھا کہ زندگی میں اگر ایسے معاملات سے واسطہ پڑتا ہے تو اس ترتیب کو ذہن میں ہونا چاہیے۔

میری دعا ہے کہ حسن عباسی جس راستے کا انتخاب کیا ہے اس پر صدقِ دل سے قائم رہ سکے اور اللہ تعالیٰ اُس کی معصومیت کا اجرا سی طرح عطا فرمائے جس طرح اس مجذوب چرواہے کو عطا فرمایا تھا۔آمین!

❁❁❁

شاہین کی شعری پرواز

عبدالوحید بسملؔ/ایبٹ آباد

بہت پیارے دوست، معروف شاعر، ایک ادب شناس اور ادیب پرور شخصیت، جناب حسن عباسی کے توسط سے جناب ولی عالم شاہین کی نظموں کے مجموعے ''شب نشین'' کا تحفہ پا کر دو طرح کی مسرت وانبساط کا احساس ہوا۔ ایک یہ کہ حسن عباسی مجھ سے بہت دور رہ کر بھی کسی نہ کسی واسطے سے میرے اردگرد دیکھے جا سکتے ہیں اور دوسرا یہ کہ آج کے ڈیجیٹل ذہانت کے دور اور تیز ترین رفتار سے بھاگتی دنیا میں بھی کہیں نہ کہیں ایسے اذہانِ عالی وجود پذیر ہیں جن کے پاس اپنے اردگرد کی دنیا کا عمیق مطالعہ، ذاتی تجربات اور چشمِ بینا سے کئے گئے مشاہدات کو ایک اعلیٰ وارفع تخلیقی جامہ پہنا کر اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچانے کا ہنر بدرجہ اُتم موجود ہے۔

جناب شاہین سے اگرچہ میری شخصی، ادبی یا میڈیائی ملاقات تو کیا، محض تعارف تک بھی نہیں مگر کسی شاعر، ادیب یا دانشور کا تعارف دراصل اس کا تخلیقی کام ہی ہوتا ہے۔ اور ''شب نشین'' کا مطالعہ ہی جناب شاہین کے عمدہ تعارف اور پہچان کے لیے کافی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو، جو شاعر کتاب کے ٹائٹل سے لیکر آخر تک ایک ایک حرف اور لفظ کی پرداخت پر اپنا خون نچھاور کرتا نظر آتا ہے اس کے تعارف کے لیے وہ تخلیقی نسخہ اگر ازخود ایک دستاویز نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا؟۔ کتاب کھولتے ہی جناب حافظ شیرازی کا مشہور شعر:

خوشش بادا نسیمِ صبح گاہی
کہ دردِ شب نشیناں را دوا کرد

عمومی ذوق مطالعہ کو خصوصی میں بدل کر متجسس اور منہمک بنا دیتا ہے جو کہ کتاب کے عنوان کی پرتیں کھولنے سے لیکر ایک ایک لفظ کے شعری ورود اور دروبست کی، حقیقی، مجازی، تشبیہاتی اور استعاراتی فضا میں مختلف معنیاتی تناظرات کی عکس بندی کے سحر میں چلا جاتا ہے۔ اسی مسحور کن فضا سے ایک پروانہ قاری کی سوچ وفکر کے لیے فہم وادراک کا پیغام لاتا ہے اور ذہن پر پرزور ڈالتا ہے کہ شب بیداری، شب خیزی، شب باشی، شب خوانی اور شب نشینی کا فرق اگر واضح ہے تو آگے چلنا ورنہ اس کی ورق گردانی سے کچھ بھی پا نہ سکو گے۔ اتنے میں صفحہ انتساب کے دریچے سے جناب غالبؔ کا ایک مصرعے کی گونج، حروف انتساب سے کشیدہ، زندگی، معاشرے اور تخلیق کار پر مشتمل ایک الٹے مثلث کے تیسرے کونے سے یوں سنائی دیتی ہے:

''کہ خارِ خشک کو بھی دعویٰ چمن نسبی ہے۔''

اب تو قاری کے کان اور بھی کھڑے ہوجاتے ہیں کہ بھائی اب پتہ چلا کہ یہ شب نشین، کوئی عام سا شب بیدار نہیں، شب باش نہیں، شب خیز نہیں، یہ تو پوری شبِ حیات میں نشست جمائے محوِ کارِ خاص ہے، اُن اسرار ورموز اور حقائق زمانہ کو جاننے کا متمنی اور دھنی ہے جو کہ دن کی روشنی میں یا تو دنیا کی بناوٹی چکا چوند میں نظر سے اوجھل رہتے ہیں یا پھر کچھ گھنگور گھٹائیں ان کو کسی استبدادی واستعماری پردے میں بہت دور تک چھپائے رکھنے کی عادی ہو چکی ہیں اور کسی کو کچھ دیکھنے سننے، پرکھنے کا موقع ہی نہیں دیا جا رہا۔ چنانچہ ''شب نشین'' کا بغور مطالعہ، تخلیق کار کی شب نشینی کا مقصد، اس کے مشاہدے کا عکس اور شخصیت کا پرتو، الفاظ کے جامے میں ڈھالتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ شب نشین تو ایک ایسا تخلیق کار ہے جو دوہرے عالمی معیارات، لسانی، نسلی اور نظریاتی تفرقات، تضحیک وتذلیلِ انساں، اور عالمی معاشی واقتصادی دوڑ میں سماجی، معاشرتی اور اخلاقی اقدار کے انقاد پر نہ صرف نوحہ کناں ہے بلکہ شدید مزاحمت کا پرچار بھی کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنے قلم کی مدد سے ہر اس سوچ اور جذبے کے ساتھ نبرد آزما ہے جو کسی بھی صورت اور نوعیت میں انسانیت کیلئے ضرر رساں یا تکلیف دہ ہے۔

''شب نشین'' میں شامل نظمیں اردو شاعری کی ایک منفرد روش سے روشناس کرا رہی ہیں۔ ذہن کے پردے پر فوراً ایک شبیہہ بنتی ہے، ایک تخلیق کار اپنے آبائی وطن سے دور رہ کر اپنے اردگرد کے ماحول، افراد، معاشرتی رسوم، سماجی رویوں، ثقافتی اقدار، مختلف نظریات اور نہ جانے اور کس کس سے متاثر ہوتا ہے، کبھی تو ان کا موازنہ اپنے آبائی ماحول سے کرتا ہے اور کبھی اسی طرح کے دیگر معاشروں سے۔ کبھی عوامی سوچ اور کبھی خواصی نظریات، کہیں ریاستی قوانین کی پاسداری سے عمدگی کی طرف کا سفر اور کہیں حدود وقیود کی دھجیاں بکھیرتے ہوئے غیر ذمہ دارانہ حرکات اور لاابالی پن کا مظاہرہ۔ کہیں معاشی واقتصادی عوامل کی یکسانی میں تفاوت اور کبھی تفاوت میں یکسانی۔ کہیں خاموشی میں شورِ زمانہ اور کہیں شورِ زمانہ میں ناگفتنی کی سی صورتِ حال سے گزر کر کس انداز سے سوچتا اور تخلیقی ودریافتی عمل کو آگے بڑھاتا ہے۔ اگرچہ اس صورتِ احوال میں کسی کو اپنے تئیں کچھ سوچنے، سمجھانے یا کوئی نئی بات کرنے اور آگے بڑھانے میں بہت سی مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر کوئی شاعر، تخلیق کار یا دانشور ان سب مشکلات کے باوجود اپنا سفر سبک رفتاری سے جاری رکھ سکتا ہے، اگر اس کے پاس وافر علمی خزانہ، سوچ فکر کی بالیدگی، خیال کی ارفعیت، تجربات ومشاہدات کی فراوانی، احساسات کی رقت اور جذبات کی صداقت کے ساتھ

ساتھ اندازِ بیاں میں حلاوت اور الفاظ کے چناؤ اور برتاؤ میں چابکدستی اور رکھ رکھاؤ جیسی خصوصیات موجود ہوں۔ اور الحمدللہ! جنابِ شاہینؔ ان تمام صفات سے متصف ہیں۔

''شب نشین'' کے مطالعے سے ایک ایسی عالمی تصویر ابھرتی ہے جس میں دورِ حاضر کے، کہیں دل گداز اور کہیں دلخراش واقعات، انسانی سوچ کے دوہرے معیار کے مناظر، زندگی کے نشیب و فراز، مختلف معاشروں کی مختلف اقدار، حاکم اور محکوم کے درمیان فاصلوں کی لکیریں، طالب و مطلوب کے ارتقائی تقاضے اور مختلف سماجی رویوں کے اتار چڑھاؤ کہیں طاقت اور سطوت کی گھٹا کے سائے میں اچھلتے کھیلتے اور کہیں مفلسی، بیچارگی اور تہی کے طوفان میں پھنسے اپنی اگلی سانس کے آنے کی امید میں ہاتھ پاؤں مارتے نظر آتے ہیں۔

جنابِ شاہینؔ کی نظمیں زیادہ تر عالمی و آفاقی تناظرات میں دیکھی جانے والی ہیں مگر رجحان تخلیق ،اندازِ بیاں اور سلیقۂ پیش کش اتنا دل کش و دلآویز ہے کہ ہر قاری کے ذہن میں بننے والی تصویر اس کے اپنے ذوقِ جمال اور حسنِ لطافت کی تسلی و تشفی کا ساماں مہیا کرتی ہے۔ نظموں کے عنوان اور تخلیقی مواد اور نظمسانہ بافندگی میں ان کی قوتِ مشاہدہ کی ارفعیت اور جذبہ فلاحِ انسانیت کو عمدہ تخلیقی عمل سے گزرتے ہوئے ان کے افکارِ عالی نے عالمی تناظرات سے متاثر کن نقوش تراشنے اور انھیں سادہ مگر پُر معانی الفاظ میں زیبِ قرطاس کرنے کا عمدہ وصف عطا کر رکھا ہے۔ وہ اپنے خیالاتِ حمیدہ کو فلاحِ انسانیت کے جذبے سے سرشاری کے عالم میں قاری تک اس خوبی سے پہنچا رہے ہیں کہ پڑھتے دم استبدادی و استعماری سوچ پر ضرب کاری بھی لگتی دکھائی دیتی ہے اور اس کے شکار معاشروں کے اذہانِ خوابیدہ اور ضمائر مدفونہ کو جھنجھوڑنے کی ہمت اور کوشش بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

انھوں نے رنگارنگ استعاراتی فضا میں عالمی سوچ و فکر کی ناہمواریوں کو بھی موضوعِ کلام بنایا ہے اور اس کے پس منظر سے بھی روشناس کرانے کی کوشش عمدہ کوشش کی ہے۔ جناب شاہین کا مطالعہ اپنے ماضی سے بھی بہت کچھ لیتا ہے اور موجودہ ڈیجیٹل ٹیکنالوجی کی سہولیات کا مقابلہ اور موازنہ حرف و قرطاس سے بھی کرتا ہے، جس میں وہ حرف و قرطاس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ایک گونہ راحت محسوس کرتے ہی۔ (اس حوالے سے ان کی نظم ''فیس بک'' دیکھی جا سکتی ہے۔)

پھر ولی عالم شاہینؔ عالمی اقتصادی اور استعماری غلبے کی کرختگی کو محسوس کرتے ہوئے کچھ یوں قلم آزما ہیں کہ غالب قوتوں کی استبدادی روش سے گھن بھی آئے اور مغلوب کی اپنی کج فہمی، کوتاہ اندیشی، اور وقت کے ساتھ چلنے میں سست روّی اور بے اعتنائی جیسی کمزوریوں کا احساس بھی ہو۔ اس حوالے سے ان کی بہت سی نظمیں ''شب نشین'' میں شامل ہیں جبکہ سہلِ ممتنع کی خوبی سے مالامال انکی نظم ''عکس تُو جس کا ہے'' سب سے زیادہ متاثر کن لگتی ہے۔

جنابِ شاہین کی نظموں میں دقیانوسی خیالات اور گھسے پٹے مظامین کی کوئی گنجائش نہیں ،وہ ان روایات کے بھی پاسدار نہیں جن کے بطن میں نادیدہ حوادث اپنا وجود چھپائے رکھتے ہیں اور کسی ایسے وقت میں وقوع پذیر ہوا چاہتے ہیں جبکہ کسی قسم کی پیش بندی ممکن نہ ہو۔ انھیں بحیثیت مجموعی قومی کمزوریاں اور ریشہ دوانیاں بھی پریشاں رکھتی ہیں۔ ایک غیر محسوس مگر پُر تاثیر خیال، ایک غائبانہ آواز کی صورت میں سنائی دیتا نظر آتا ہے۔ جس کی گونج میں وہ سارا منظر ایک ساکت تصویر کا رخ اختیار کر لیتا ہے۔ اور انھیں تراشیدہ ستاروں میں ہجرت آمادہ پرندوں کے اُڑتے پروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں، جبکہ اپنا تعلق اس زمیں سے اُکھڑتا نظر آتا ہے اور ارادے بھیگے ہوئے کاغذ کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ پھر ایک بھیانک خواب کی سی کیفیت سے گزرتے ہوئے اپنے آپ کو ڈھونڈنا پڑتا ہے مگر ایک عجیب پس ماندہ کیفیت کا اثر دکھتا ہے کہ جس میں ہم اپنے اندر کے کھنڈر کے خلا میں ایسے ایسے محل تعمیر کئے جا رہے ہیں جو شاید پھر سے کھنڈر بن جائیں مگر اب اس کام کو مسلسل جاری ہی رہنا ہے۔ کیونکہ ہم نے زندگی سے اپنی شریانوں کی گرہیں باندھ رکھی ہیں۔ -- یہ کیفیت دراصل ایک لمبے عرصے سے کہیں نہ کہیں محسوس تو کی جا رہی ہے مگر اس کے اندر چھپے خطرات کا ادراک اور اس کا اظہار اتنا آساں نہیں کہ ہر کوئی کرتا پھرے جناب شاہین نے اس پوری کیفیت کا تناظری خاکہ اور پیش منظر اپنی ایک نظم ''گیلا کاغذ'' میں کچھ یوں سمویا ہے کہ پڑھنے والے کو کچھ دیر سوچنے، سمجھنے اور پھر شاعر کی نہایت گہری ادراکی اور وجدانی رسائی دیکھ کر لامحالہ داد دینی پڑتی ہے۔

ولی عالم شاہینؔ جہاں قوت ہائے فہم و فراست اور وجدان و ادراک کی معجز نمائی کے توسط سے اعلیٰ و عمدہ شعری تخلیقات کے مرقعے پیش کر رہے ہیں وہیں ان کی نگاہ مغربی مفکرین اور رائٹرز کے کام پر بھی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سے شعرا، دانشوران، اور دیگر اذہانِ عالی کو اپنے زیرِ مطالعہ رکھ کر ان کی شخصیات کا ذکر ایک استعاراتی فارم میں بھی کیا ہے اور براہ راست ان کو خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ اور کہیں کہیں مختلف تناظر میں بھی رکھا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے ''نائن الیون'' پر لکھی گئی نوئم چومسکی کی کتاب بعنوان'' 'NINE ELEVEN' سے ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے ''ستمبر گیارہ'' کے عنوان سے ایک شاہکار نظم اس کتاب میں شامل کی ہے۔ جس سے نہ صرف کسی مغربی رائٹر کو خراجِ تحسین کا جذبہ نمایاں نظر آتا ہے بلکہ جنابِ شاہینؔ کی شاعرانہ دلیری اور تخلیقی دوڑ کی اعلیٰ سطح تک رسائی بھی واضح ہوتی

ہے۔اسی طرح انھوں نے اپنی ایک اور نظم ''زیاں حاصل کا'' میں نیوٹن کو بطور استعارا پیش کیا ہے اور اپنی قوم کے پاس مواقع کی فراوانی اور دسترس کے باوجود کچھ نہ کرسکنے پر شدید تاسفانہ انداز اپنایا ہے۔ بظاہر تو ایسے ادبی شہکار وقتی طور پر کسی نام کے نمائندہ بن کر سامنے آتے ہیں مگر بادی النظر میں ان کا اثرات بہت گہرے اور دیرپا ہوتے ہیں۔قومیں اکثر ایسے ہی افکار سے بنا کرتی ہیں جن میں کسی دوسرے کی اہمیت کو اجاگر کر کے اپنی کوتاہیوں اور کمیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے اور ان کے ازالے کے لیے ذہن سازی کی جاتی ہے۔قوم کے سامنے ''فروٹ آف تھاٹ'' رکھا جاتا ہے، اور اس طرح، آنے والوں میں بہت سے نیوٹن، حافظ، غالب، خیام، خلیل حاوی اور ابو تمام جنم لیتے ہیں۔

پھر کسی شاعر کیلئے سب سے اہم بات اس کا پیرایہ اظہار ہوتا ہے۔ بسا اوقات ایک انتہائی نازک اور اہم مسئلے کو فنِ اظہار کی کجی کے باعث محض عامیانہ بنا کر پیش کیا جاتا ہے جبکہ دوسری جانب ایک عام اور معمولی سے واقعے کو اظہار بیاں کی ندرت اور خیال کی تازگی نہایت اہم اور قابلِ توجہ بنا دیتی ہے۔اس حوالے سے جناب شاہین کے پاس عمدہ فنِ اظہار موجود ہے اور ہمیں قدم قدم پر ان کی اس فن پر دسترس اور مہارت کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔۔''بسلامت روی'' ''پیڑوں سے پتے گرتے ہیں'' ''کرتار پور'' ''فاصلہ'' ''زہرہ حسینی''

''چڑیلیں'' اور کئی دیگر نظمیں اس حوالے سے بطور نمونہ پیش کی جاسکتی ہیں۔

در اصل نظم گوئی میں جس تدقیق اور دقت النظری کی ضرورت ہوتی ہے جناب شاہین کے ہاں بڑی آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔اجمالی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ہر نظم اپنی ساخت اور موضوع کے لحاظ سے ایک ایسی وحدت رکھتی ہے جس میں فن کا چلتا پھرتا حوالہ اپنے دیرپا نقوش چھوڑے چلا جاتا ہے۔اگر ان کی نظموں کا موضوعاتی جائزہ لیا جائے تو ان کی نظموں کی فکری سمت انسان سے انسانیت اور مقامیت سے آفاقیت تک کے سفر سے متعین کی جاسکتی ہے۔پھر نظم کا مختصر ہونا اس کی اثر پذیری میں معاون ہوتا ہے۔ جناب شاہین نظم کے اس خصوص سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اور کشائش لفظی کو عملی طور پر برتنے کا ہنر بھی جانتے ہیں۔ایک نظم بعنوان ''حساب'' ملاحظہ کیجیے:

اچانک اس نے سرِ راہ خواب مانگا تھا
کسی بیاض سے پھاڑا ہوا ورق دیکر
دلِ شکستہ کا پورا حساب مانگا تھا

اسی طرح ان کی بہت سی نظمیں نہ صرف اختصار کی خوبی سے متصف ہیں بلکہ کشائش لفظی کے وصف کی بھی عمدہ مثالیں ہیں۔نمونے کے طور پر نظمیں ''دردِ شب نشیناں'' ''زیاں حاصل کا'' اور ''زمین'' دیکھی جاسکتی ہیں۔۔

پھر ''لامساوی'' ایک اور نظم ہے جو اپنی فنی پُرکاری کے لحاظ سے ایک بھرپور نظم ہے۔موجودہ گھٹن، انتشار اور فشار کے اثرات انسانی سوچ و فکر اور شعور پر کس طرح مرتب ہوتے ہیں اور ایک بالیدہ فکر کس طرح ان خطرات کو بھانپتی ہے اس کا پتہ اس نظم کے مطالعے سے ہوتا ہے:

اس قدر یہ غیر مستحکم سی دنیا
لامساوی بھی ضرورت سے زیادہ
منحصر ایک دوسرے پر
پھر بھی اکثر
بے خبر اور لاتعلق
اپنے اپنے خول میں بدمست
یہ سرخیل نو
(جن کی اپنی خیریت مشکوک ہے)
چھوڑ جائیں گے
نہ جانے کیسی بدحالیہ کا ورثہ
اپنے، میرے، تیرے بچوں،
ان کے بچوں کے لئے
دھیان کا ہے وقت اب بھی
ورنہ ہو جائے گی دیر
دیر ایسی
ہر طرف آسیب ہی آسیب ہوں گے۔

پھر انھوں نے آج کی خانگی زندگی کو بھی اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے جس میں انھوں نے اس وقت ہر طرف پھیلی ہوئی رویوں کی ہولناکی اور ان میں ناگفتہ بہ تختی و بے اعتنائی اور اس کی وجہ سے ایک نسل پیچھے کے لوگوں کو لگنے والے دھچکوں کا وہ نقشہ کھینچا ہے جسے پڑھ کر قاری کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔نظم ''دھچکے'' (صفحہ نمبر ۲۸ اور ۲۹، شب نشین)

یوں تو جناب ولی عالم شاہین کی ہر ہر نظم اپنے اوپر ایک مکمل مضمون کی متقاضی ہے مگر طوالتِ مضمون سے بچنے کے لئے کیلئے آخر میں جناب شاہین کی سوچ و فکر کا ایک اور زاویہ نظم ''چین والے'' کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔

بھروسے کی کسوٹی پر
سنا ہے
اہلِ چین اپنے کسانوں کو سرِ فہرست رکھتے ہیں
پھر اس کے بعد
رتبہ رہنمائے دیں کا آتا ہے
طوائف اور دیگر جنس کار
اس سلسلے میں تیسرے درجے پہ فائز ہیں
جہاں تک مسئلہ اہلِ سیاست کا ہے
وہ چھبیسویں ہیں درجہ بندی میں
مگر طرفہ تماشا ہے
کہ دنیا ان کی جانب دیکھتی رہتی ہے
حسرت سے!!!!!

اور میں دیکھ رہا ہوں جناب شاہین کے کسی تازہ فن پارے کی طرف، حسرت سے۔۔۔۔

✿✿✿

شاعری

کوئی ثاقب دیا ہے جلتا بجھتا
مرا ہی جیوڑا ہے جلتا بجھتا
ہوئی پلکوں پہ جس کی رونمائی
وہ آنسو جل بجھا ہے جلتا بجھتا
ہتھیلی پر چراغِ آشنائی
یہ اک حرفِ دعا ہے جلتا بجھتا
حنائی رات ہم نے شاعری کی
یہی اک موگرا ہے جلتا بجھتا
سفر میں ٹھوکریں کھانی پڑی ہیں
وفا کا راستہ ہے جلتا بجھتا
کوئی صورت نظر آتی نہیں ہے
مجھے کمرہ ملا ہے جلتا بجھتا
کبھی اندھا کبھی بینا ہوا ہے
ہمیں دھڑکا ہوا ہے جلتا بجھتا

آصف ثاقب/بوئی ہزارہ

رخصت ہوا جس دن سے ترے ساتھ کا موسم
آنکھوں میں مکیں ہو گیا برسات کا موسم
اس شہر کے موسم پہ مسلط ہے کثافت
بہتر ہے کہ آ جائے مضافات کا موسم
یہ موسمِ گل ایک نئی شان سے لایا
گرتے ہوئے پتوں کی مدارات کا موسم
اُکسایا مرے دل نے کئی بار اگرچہ
آنے نہ دیا تجھ سے شکایات کا موسم
اس آس پہ برداشت کئے تیرے ستم بھی
آئے گا ترے لطف و عنایات کا موسم
درویش جو چاہیں تو دکھا سکتے ہیں پل میں
صحراؤں میں مہکے ہوئے باغات کا موسم
موسم تو جدائی کے کئی آئے تھے لیکن
بیتا ہی نہیں تجھ سے ملاقات کا موسم!
تُو دیکھ کبھی اپنی ہتھیلی کی لکیریں
تحریر وہاں بھی ہے مرے ہاتھ کا موسم
دل اس پہ مُصر ہے تو یہی کہنا پڑے گا
منظور نہیں رسم و روایات کا موسم
یخ بستہ ہے موسم تو کوئی فکر ہی کیا ہے
دل میں ہے سلگتے ہوئے جذبات کا موسم

نسیم سحر/راول پنڈی

دیواروں کے رنگ تھے پیلے، سب دروازے کالے تھے
گرد جمی تھی یادوں کی اور گھر کی چھت پر جالے تھے
پریوں اور شہزادوں جیسے نقش تھے بستی والوں کے
باتیں تھیں جانی پہچانی، لوگ بھی دیکھے بھالے تھے
چہروں پر جھریاں، پاؤں ننگے، پھٹے پرانے کپڑے
ان کی آنکھیں بول رہی تھیں جن کے منہ پر تالے تھے
حق کی باتیں کرنے والے بھاگ گئے سب آخر کار
پتھر بن کر کھڑے رہے جو پتھر کھانے والے تھے
ہجر کے دشت میں عمر گزاری، وصلِ یار کی خواہش میں
ریت پہ چلتے چلتے پھوٹے پیروں میں جو چھالے تھے
کوئی اور ظہور نہیں تھے دست و گریباں آپس میں
ایک خدا اور ایک نبیؐ کے سارے ماننے والے تھے

ظہور چوہان/بہاولپور

اس کی حیرانیوں سے ظاہر ہے
سب پشیمانیوں سے ظاہر ہے
درد گہرائیوں میں اُترا ہے
نیلگوں پانیوں سے ظاہر ہے
پھر مکیں لوٹ کر نہیں آئے
گھر کی ویرانیوں سے ظاہر ہے
سیل بستی ڈبو کے چھوڑے گا
اس کی طغیانیوں سے ظاہر ہے
بے جہت ہو گئے ہیں لوگ یہاں
ان کی پیشانیوں سے ظاہر ہے
لگتا ہے عشق جیت جائے گا
اس کی جولانیوں سے ظاہر ہے
عقل ہی اب تو ہار مانے گی
دل کی نادانیوں سے ظاہر ہے
درد ایسے ہی جگمگائے گا
اس کی تابانیوں سے ظاہر ہے
کوئی موقع کی تاک میں ہے جلیل
سخت نگرانیوں سے ظاہر ہے

احمد جلیل/اوکاڑہ

بس ایک شکوۂ وحشت رضا کے اندر بھی
بقا کا درد چھپا ہے فنا کے اندر بھی
ذرا سا پاؤں دھرا اُس نے دل کی دھرتی پر
چراغ جلنے لگے تھے ہوا کے اندر بھی
یہ خوف تھا کہ پرندے ہی مر نہ جائیں کہیں
کہ حبس بڑھنے لگا تھا فضا کے اندر بھی
کسی نے روک لی ہاتھوں سے درد کی دیوار
وگرنہ شور بپا تھا خلا کے اندر بھی
کہاں کسی پہ کبھی منکشف ہوا کچھ بھی
بہت سے راز نہاں تھے دعا کے اندر بھی
یہ کیسی عرضیاں لکھ دی تھیں میرے اشکوں نے
یہ کس کی سسکیاں بکھریں صدا کے اندر بھی
نہ خوفِ مرگ نہ ہی زیست کی تمنا تھی
یہ زہر کس نے ملایا دوا کے اندر بھی
اسی لیے تو وہ چارہ گری پہ مائل ہے
کوئی ملال اُٹھا ہے خدا کے اندر بھی

بس ایک آس تھی ورنہ یہ زخم کاری تھا
قدم قدم تھے شکستہ وفا کے اندر بھی

آسناتھ کنول/لاہور

زباں بندی بھی نعمت ہے، بناتی ہے نصیب اکثر
تکلم جس کا خاموشی وہی دل کے قریب اکثر
وہ اپنی پیش بندی سے پلٹ دیتے ہیں سب منظر
بدلنے ہم کو پڑتے ہیں زمانے میں نقیب اکثر
نگینہ تب سنورتا ہے کہ گزرے پہل کاری سے
مگر ہم پہل کاروں کو سمجھتے ہیں رقیب اکثر
جگر کے زخم کا مرہم وہ آنکھوں میں لگا کر جب
دلیلِ خام دیتے ہیں تو لگتے ہیں عجیب اکثر
اسیرِ زلفِ جاناں ہوں، کسی نے دل کو چھیڑا ہو
علاج غم کیا کرتے ہیں ایسے ہی طبیب اکثر
غزل ہو یا فسانہ ہو کہ ہو کوئی بھی فن پارہ
دکھاتا ہو نہ فن کاری تو لگتا ہے معیب اکثر
نشے میں اپنی سطوت کے جو آپے سے بھی ہو باہر
تو بسمل اس رعونت کا نتیجہ ہے مہیب اکثر

عبدالوحید بسمل/ایبٹ آباد

جو فالتو پڑے ہیں انھیں فون سے نکال
بے وزن لوگ پیار کے مضمون سے نکال
یہ تھوک کی دکاں ہے اگر دے سکو تو دو
اس پیار کے حساب کو پرچون سے نکال
پہلے تو اپنی ذات میں خامی تلاش کر
پھر اپنی اس شکست کو رنگون سے نکال
تاریخ دان یا تو یہ شجرہ مرا بدل
یا خوئے حکمرانی مرے خون سے نکال
اے یار تیرے ہجر میں جل بھن گیا ہوں میں
آ کر مجھے تو ہجر کے اس جون نکال

راؤ حیدر اسد/ملتان

دغا میں کوئی بھی ایسا عدو نہیں آیا
ہماری تیغ پہ جس کا لہو نہیں آیا
یہ مت سمجھ کہ مجھے جاں عزیز ہے اپنی
اگر کبھی تہہِ خنجر گلو نہیں آیا
ہماری پُرسشِ احوال کے لیے اکثر
ترا خیال تو آیا ہے تُو نہیں آیا
وہ ناتواں تھا کہ تیغِ عدو کے چلنے پر
مرے وجود سے باہر لہو نہیں آیا
میں ایسا پیڑ ہوں جس پر بہار ہو کہ خزاں
کسی بھی دور میں بارِ نمو نہیں آیا
وہ نا اُمید ہوا ہوں خدا کے ہوتے ہوئے
مری زبان پہ لاتقنطو نہیں آیا
محاذِ عشق سے ناکام آ گیا لیکن
خدا کا شکر کہ بے آبرو نہیں آیا
کہیں نہ پھر سے اداس نے گھیر رکھا ہو
جو چاند آج سرِ آب جو نہیں آیا
ہاں! وہ طبیب تو آیا تھا نیشتر کے لیے
برائے زحمتِ کارِ رفو نہیں آیا
مجھے پتہ ہے محبت ہے کیا ہوس ۔ ہے کیا
سو اُس کو دیکھ تو آیا ہوں چھو نہیں آیا
کبھی نہ ہاتھ لگاؤں گا تیر و ترکش کو
اگر نکال کے چشمِ عدو نہیں آیا
میں آ گیا تری بزمِ نشاط میں لیکن
بدل کے شدتِ گریہ کی خو نہیں آیا
وہ عکس مجھ کو مکمل دکھائی دے کیسے
جو آئینے میں کبھی ہو بہو نہیں آیا

ازور شیرازی/کوئٹہ

لاوا ہے دل کا اشک نکلنے بھی دیجیے
آتش فشاں کو آگ اُگلنے بھی دیجیے
اک برف سی جمی ہے دلِ پُر ملال پر
سوزِ نہاں سے اس کو پگھلنے بھی دیجیے
روشن رواقِ دل میں ہوا ہے چراغ عشق
دل کا دِیا جلا ہے تو جلنے بھی دیجیے
پیروں کے آبلوں کی نہیں فکر اب ہمیں
چلنا ہے خار زار میں چلنے بھی دیجیے
مسحور کُن نگاہ سے مت دیکھیے مجھے
میں لڑکھڑا رہی ہوں سنبھلنے بھی دیجیے
پاؤ گے تم سکون بھی سائے میں ایک دن
نخلِ وفا کو قلب میں پلنے بھی دیجیے
آئے گی صبحِ نُو بھی سحر شب کے بعد میں
سورج میری امید کا ڈھلنے بھی دیجیے

عفراء بتول سحر

ایسے خالی مکاں میں رہتا ہوں
جس کے دیوار و در پہ کائی ہے
خود پہ گزرے ہوئے ہر اک موسم
بارشوں، دھوپ اور جاڑے کے
گرد آ سودہ ہواؤں کے
خوب چپ چاپ نقش ظاہر ہیں
کھڑکیاں جس کی ایک عرصے سے
بند ہیں اور کھل نہیں سکتیں
صحن میں ایک پیڑ ہے جس پہ
چند روٹھے اُداس سے پنچھی
زندگی کے سفر سے تنگ آ کے
شام ہوتے پڑاؤ کرتے ہیں
ٹہنیوں میں بہار موسم میں
سبز پتوں نے آنکھ کھولی ہے
صحن کے مختصر احاطے میں
روز پہروں ہوا کے چلنے سے
خشک پتوں کا اور تنکوں کا
ایک بیزار رقص رہتا ہے
ایک خاموش سی اذیت کا
شائبہ بھی ہے کہ مسلسل جو
ہائے مجھ کو ستائے جاتا ہے
سلسلہ ہائے کو سوالوں کا
اتنی خاموشیوں کی نسبت سے
دیپ مجھ کو اُڑائے جاتا ہے
ایسے خالی مکاں میں رہتا ہوں

شہزاد دیپ/جھنگ

افسانہ

پرانی چیز

تحریر: اظہر جاوید/ترجمہ: حنیف باوا

"باباجی! آپ کے پاس کوئی باریک سی تار ہے کیا؟"

وقار نے باریک کہتے ہوئے اپنی آواز کو بھی باریک کیا اور بڑھا کر تار جتنا لمبا کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اُس نے دائیں ہاتھ کے کلمے والی اُنگلی پر انگوٹھے کا دباؤ ڈال کر اپنی جانب سے تار کا نقشہ کھینچا۔

بات کرنے کے بعد وہ چپ کا اور اُس کے قریب ہی کھڑا طارق بھی منہ پرے کر کے کھی کھی کرنے لگا۔

وقار اور طارق دونوں ماموں اور پھوپھی زاد بھائی تھے۔ دونوں آٹھ آٹھ دس دس سال کے ہوں گے۔ اُن کے عقب میں دوسرے کمرے اور اس کمرے کی راہداری میں اُن کے اور بھی ماسی اور چچا کے بیٹے اور بیٹیاں اور ہم عمر، تار لانے اور پھر باہم مل کر کھلکھلا کر ہنسنے کے انتظار میں بے تاب کھڑے تھے۔

باباجی، وقار کے دادا تھے...... کسی دوسرے بچے کے نانا اور کسی کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ نام تو ان کا غلام قادر تھا لیکن گھر میں تمام لوگ اُنھیں باباجی کہہ کر بلاتے تھے۔ محلے اور بستی کے رہائشی انہیں صوبیدار لام والے کے نام سے پکارتے تھے۔ دوسری بڑی جنگ میں وہ فوج میں بھرتی ہو کر کئی سال لام پر رہے تھے۔ وہاں کی دستیاب نہ ہونے والی کہانیاں اُن کے پاس تھیں یا پھر ایک جستی ٹرنک تھا جس میں نہ جانے کیا بھرا ہوا تھا۔ وہاں جہاں بھی وہ ٹھکانہ کرتے یہ ٹرنک اُن کے ہمراہ ہوتا تھا۔ ان کی بہو کو اس سے بڑی چڑ تھی۔ ابتدا میں اُس نے باتوں باتوں میں اس ٹرنک کو باہر پھینکنے کا عندیہ ظاہر کیا تھا لیکن اب وہ برہم سی رہنے لگی تھی۔

آج کل یہ تمام لوگ مری آئے ہوئے تھے۔ باباجی، غلام قادر صوبیدار جی لام والے اور ان کا بہت بڑے عہدے پر فائز بیٹا نثار قادر جس کی لاہور میں بہت وسیع کوٹھی تھی اور وہ ایک طرح سے پنجاب کا حاکم لگتا تھا۔ مری میں بھی اُس کا اپنا بنگلہ تھا اور تمام بچے یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ ان بچوں کی خالائیں، چچے، ماموں اور پھپھیوں کی اولاد بھی تھی۔ بڑوں کی طرح بچوں کو بھی ٹرنک کی حقیقت کا ادراک تھا۔ جب کبھی اُن کی بہو شاہدہ نثار ان سے تکرار کرتی اور ٹرنک کو پھینکنے کا کہتی تو باباجی بول پڑتے:

"بیٹی! اس میں بہت سی چھوٹی چھوٹی پرانی چیزیں پڑی ہوئی ہیں نہ جانے کب کسی شے کی ضرورت پڑ جائے۔"

شاہدہ اس بات سے مزید خشمگیں ہو جاتی اور کہتی:

"باباجی کون سی چیز ہے جو بازار سے نہیں ملتی اور پھر ہمیں کمی کسی چیز کی ہے۔ آپ نے ایسے ہی پرانی چیز کا بہانہ بنا رکھا ہے۔"

نثار! بات سنیں۔ شاہدہ کم غصے اور زیادہ پیار سے گھر والے کو بلاتی اور کہتی "نثار! آپ بھی والد کو نہیں سمجھاتے۔ پرانی چیزوں کا اب بھلا کوئی وقت ہے...... پرانی شے...... پرانی شے" وہ بڑبڑ کرتی ہوئی ایک طرف ہٹ جاتی اور پھر تمام غصہ خانسامے، ڈرائیور یا مالی سے بول کر نکال لیتی۔ نثار جب کبھی گھر ہوتا تو بیگم صاحبہ کے ہتھے چڑھ جاتا اور پھر بات سے بات نکلتی ہوئی ٹرنک تک پہنچ جاتی۔ نثار بلاشبہ بڑا افسر تھا، صوبے کا حاکم تھا لیکن پھر بھی باپ کا فرمانبردار تھا۔ اُس نے کبھی بھی ان سے اونچی آواز سے بات نہیں کی اور نہ کبھی کسی بات پر بحث کی تھی۔ نوکروں کو بھی حکم تھا کہ اپنے تمام کام چھوڑ کر پہلے باباجی کی بات سنا کریں۔ جب شاہدہ گھما پھرا کر یا کسی ہنسی مذاق کی بات کو پکڑ کر ٹرنک تک لے آئی تو نثار قادر سوچ میں پڑ گیا کہ یہ آخر مسئلہ کیا ہے؟ باباجی کا ٹرنک سے کیا لگاؤ ہے اور شاہدہ نے کیوں ضد پکڑ رکھی ہے۔

ایک شام ٹیلی فون کی کالز اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر نثار قادر باپ کے کمرے میں آ گیا۔ ان سے خیریت دریافت کی۔ دوا دارو کی بات کے بعد بڑی معصومیت سے ٹرنک کے بارے میں پوچھنے لگا۔ صوبیدار غلام قادر لام والے نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا:

"اچھا تو تو بھی میرے ٹرنک کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"نہیں ابا جی" نثار نے گھبرا کر جواب دیا: "ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو بچپن سے اسے دیکھتا آ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس ٹرنک کی عمر مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تو آپ کا پہلا بیٹا ہے۔"

صوبیدار غلام قادر لام والے نے نظریں اُٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو کھل کھلا کر ہنس پڑا۔ "ہاں نثار بابو کہتا تو تُو ٹھیک ہی ہے۔" صوبیدار جب فوج میں تھے تو بیٹے کو بابو کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ "بیٹا جی! یہ ٹرنک سچ مچ میرا بڑا پرانا ساتھی ہے۔ پرانی چیز تو پھر پرانی ہی ہوتی ہے۔ آج کے چمڑے کے سوٹ کیسوں میں بھلا

وہ بات کہاں۔ تمھیں پتا ہے کہ یہ ٹرنک لام پر بھی میرے ساتھ رہا ہے۔'' صوبیدار صاحب نے بات کو درمیان میں چھوڑا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔

''آپ تمام لوگ کہتے اور پوچھتے رہتے ہو کہ اس ٹرنک میں کیا ہے؟ اسے اور دیگر پرانی چیزوں کو میں کس لیے سنبھال کے رکھتا ہوں......ہا......ہاہ......''

صوبیدار صاحب نے ایک لمبا سانس لیا۔

ہر پرانی شے باؤ نثار نہ قابل توجہ نہیں ہوتی، لیکن کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں کام آ ہی جاتی ہے۔ بیٹا میں آپ کو بتاتا ہوں! جب میں بڑی جنگ میں گیا تھا تو ایک موقع پر جب میں جاپانیوں کا قیدی ہوا وہاں مجھے اس بات کا پتا چلا۔'' صوبیدار لام والے نے بات کو روکا اور اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے ابھی بھی وہ اُس بیتے سمے کا انتظار کر رہے ہوں۔

''جاپانی جتنے لڑاکا، بہادر اور جی دار تھے اُتنے ہی انسانوں سے پیار کرنے والے بھی تھے۔ میں اُن کا قیدی تھا، لیکن انھوں نے مجھ سے میری بندوق اور سنگین لینے کے علاوہ اور کچھ نہ چھینا۔ اتحادی فوج جن لوگوں کو بھی قیدی بناتے تھے انھیں اس طرح اندر بند رکھتے تھے جیسے کبوتر کے پر کاٹنے کے بعد بھی اُسے پنجرے میں بند کر کے باہر تالا لگا دیا جائے۔ جنگ کے دنوں میں صرف گولی کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ جس گروہ کا میں قیدی تھا اُسے نہ تو انگریزی آتی تھی اور نہ ہی انھیں میری زبان کی شد بد تھی۔ لیکن انسانیت کی زبان تو بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شاید جاپانی لوگوں نے اس بات کو پا لیا تھا کہ ہم بے چارے ہندوستانی تو کرائے کے سپاہی ہیں۔ ہمارا دنیا کی سیاست سے کیا واسطہ؟ کچھ میرے جیسے بندے نوکری کی وجہ سے اور کچھ جاگیرداروں اور وڈیروں کی ضرورتوں کے لیے اور کچھ فرنگی بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے جنگ کی آگ میں جھونکے گئے تھے۔ پرائی موت مرنے کا بھلا کسے شوق ہوتا ہے نثار بیٹے۔''

صوبیدار صاحب نے بات کرتے ہوئے کربناک لہجے میں کہا ''جس فوجی چوکی پر جاپانیوں کا قبضہ تھا، اس پر اتحادی فوجیں متعدد مرتبہ حملہ کر چکی تھیں۔ میں بھی ایسے ہی حملے میں اپنی پلٹن سے بچھڑ کر قیدی ہو گیا تھا۔ بات دونوں جانب سے ایک جیسی تھی۔ ادھر بھی قیدی...... ادھر بھی قیدی اُدھر بندوق اُٹھا کر مالکوں کے دشمنوں پر گولی چلانا، دوسروں کو مارنا اور خود بھی موت کا انتظار کرنا۔ یہاں یہ بات نہیں تھی۔ تمھیں بتاؤں بیٹا نثار'' بابا جی نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔

''ان پرانی چیزوں کو سینت کر رکھنے کی عادت مجھے جاپانیوں سے ملی ہے۔ ایک روز اُن کی کھسر پھسر اور اجنبی زبان سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی خاص حرکت ہونے والی ہے۔ تمام جاپانی سپاہی اور افسر اپنے اپنے تھیلے اُلٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انہوں نے کیل کانٹوں اور پھل فروٹ کے خالی ڈبوں کا ڈھیر لگا دیا۔ اُن کا ایک افسر میرا دوست بن گیا تھا۔ اُس کے شہر میں اُس وقت کے ہندوستان کے کچھ بندے روزگار کی تلاش میں پہنچے ہوئے تھے اور وہیں پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس جاپانی افسر کی اُن کے بچوں کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ ایسا ہونے پر وہ میرا بھی ہمدرد بن گیا تھا۔ اُس افسر نے مجھے بتایا کہ آج رات ہم دشمن پر حملہ کرنے والے ہیں اور دستی بم بنانے کے لیے کیل کانٹوں اور لوہے کے ٹکڑوں کی ضرورت تھی۔ جاپانی لوگ پرانی چیز کو کبھی ضائع نہیں کرتے بلکہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ہم سب سپاہیوں کے پاس سے بکسوئے تو مل گئے تھے لیکن ایک باریک سی تار نہیں مل سکی تھی جسے دستی بموں کے گرد لپیٹنا تھا۔ وہ تار پلٹن کی ایک نرس سے مل گئی۔ اب رات کا منصوبہ بالکل تیار ہو چکا تھا۔''

صوبیدار جی نے پانی کا گلاس پکڑا، ایک گھونٹ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے ''جاپانیوں نے حملہ کیا، اتحادی فوجوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا لیکن جوابی حملے میں جاپانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ جب جاپانی چوکی چھوڑ کر بھاگے تو مجھے اُس افسر نے زور سے دھکا دیا اور کہا ''بھاگ جاؤ...... اب موقع ہے۔ اب راستہ ڈھونڈنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

غلام قادر لام والے نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا ''بس بیٹے لام کی یادیں ہیں اور یہ پرانا ٹرنک ہے اور اس میں پڑی ہوئی ہر شے پرانی ہے اور نثار باؤ میں بھی تو ایک پرانی چیز ہی ہوں۔'' یہ بات کرتے ہوئے بابا جی کا جیسے گلا رندھ گیا تھا اور نثار قادر بھی جیسے اُداس ہو گیا۔

وقار اور طارق بابا جی سے باریک سی تار لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں ایک مکینک ٹیلی ویژن ٹھیک کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ باہر برف باری ہونے لگی تھی اور مکینک واپس دکان پر نہیں جا سکتا تھا۔ بابا جی کی پرانی چیز پتلی تار نے زمانے کے عجوبے ٹیلی ویژن کو پھر سے کارآمد بنانے کے کام آ گئی تھی۔ ٹیلی ویژن چلا لیکن سکرین پر کچھ دھبے سے آنے لگے تھے۔ مکینک نے بچوں سے کہا ''آج آپ صبر کریں، میں کل آ کے چھت پر سے انٹینا ٹھیک کر دوں گا۔''

نثار قادر اور شاہدہ نثار دونوں میاں بیوی اسلام

آباد کسی وزیر سے ملنے گئے لیکن وہ شام کو واپس آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ مری والے بنگلے میں اب بابا جی برا جمان تھے۔ کچھ بچے اور باقی نوکران کے ہمراہ تھے۔ باہر برف ایسے گر رہی تھی جیسے میدانی علاقوں میں ساون بھادوں کی بارش برستی ہے۔ شاید کوئی کرکٹ میچ تھا یا ٹیلی ویژن پر کوئی اور اچھا سا پروگرام آ رہا تھا۔ تمام بچے ٹیلی ویژن کی سکرین پر دھبوں سے بور ہو رہے تھے۔ تمام ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے لگے کہ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ چھت پر جا کر انٹینا ٹھیک کر سکے۔ بچوں میں ہیرو، ٹارزن اور سپر مین کہلانے کا شوق ہوتا ہے۔ وقار نے بڑھک ماری۔

''میں نہیں ڈرتا...... نہ برف سے اور نہ چھت پر جانے سے۔ ابھی پانچ منٹوں میں انٹینا ٹھیک ہو جاتا ہے اور ٹیلی ویژن کی سکرین بھی۔''

وقار اُٹھنے لگا تو طارق نے کہا:

''یار رہنے دے، اصغر خانسامے یا برکت کو کہہ دیتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' وقار نے اکڑ کر کہا ''میں کسی سے کم ہوں؟''

وقار چھت پر گیا۔ جب کافی دیر تک اُس کی کوئی آواز نہ آئی اور نہ کوئی اُس کا پتا چلا تو باقی بچوں نے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ پرے دور سے کچن میں سے اصغر اور اُس کے ساتھ برکت بھی دوڑتے ہوئے آئے۔ بچوں نے وقار کے بارے میں بتایا اور وہ بھاگ کر چھت پر گئے وہاں وقار گرا پڑا تھا اور اُس پر برف پڑے چلی جا رہی تھی۔ اصغر باورچی نے جلدی سے وقار کو اُٹھایا۔ آوازیں دیں، لیکن وقار تو بالکل چپ تھا۔ اُس کے سر سے بہنے والا خون بھی برف سے جم گیا تھا۔

بچوں نے شور مچایا تو بابا جی بھی اپنے کمرے سے بھاگ کر باہر نکلے۔ اصغر خانسامے کے ہاتھوں میں بے ہوش اور لہو سے لت پت وقار کو دیکھ کر لحہ بھر کے لیے وہ بھی گھبرا گئے تھے۔ اندر سے صوبیدار لام والا آیا اور اُس نے انہیں حوصلہ دیا۔ انہوں نے اپنا گرم لحاف وقار پر ڈالا اور برکت کو کار لانے کا حکم دیا۔ کار آ گئی۔ ایک دو نوکروں کو روتے ہوئے بچوں کے پاس چھوڑ کر بابا جی نے کار کا رُخ ہسپتال کی جانب مڑوایا۔ جاتے ہوئے انہوں نے اصغر باورچی کو زور دے کر کہا کہ جلدی سے صاحب کو اسلام آباد میں فون کر دینا۔

لگتا تھا جیسے برف نے آج ہی برسنا ہے۔ بابا جی ہسپتال پہنچے تو خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب وہاں موجود تھے۔ انہیں جب پتا چلا کہ نثار قادر کا بیٹا زخمی ہو کر آیا ہے تو انہوں نے ہسپتال میں ہلچل مچا دی۔ جونیئر ڈاکٹروں اور ڈسپنسروں کو بلا لیا۔ جب مرہم پٹی ہو گئی، ٹیک لگ گئے تب بھی وقار کو ہوش نہ آیا تو ڈاکٹر گھبرا گئے۔ انہوں نے چیک کیا تو پتا چلا کہ لہو بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اسے تو بہت جلد خون دینے کی ضرورت ہے۔ ہسپتال میں خون موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے صوبے دار غلام قادر کی طرف دیکھا اور بات کو آگے بڑھایا۔ برکت مالی اور ڈرائیور نے ڈاکٹر سے کہا ہمارا خون لے لیں۔ نرس نے چیک کیا۔ اُن دونوں کا خون وقار کے خون سے نہیں ملتا تھا۔ فون کر کے گھر سے اصغر باورچی کو بلایا۔ اُس کا خون کا گروپ بھی دوسرا تھا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ اسلام آباد بات ہو گئی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے مری کی تمام سڑکیں بند ہیں۔ صاحب اور بی بی جی آ نہیں سکتے۔

ہسپتال کے فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے نثار قادر کی اور پھر شاہدہ نثار کی گھبرائی ہوئی اور رندھی ہوئی آواز آئی۔ وہ وقار کے بارے میں پریشان اور جلد نہ پہنچنے پر دکھی تھے۔ ڈاکٹر نے کچھ تسلی دی اور ساتھ ہی دعا کرنے کے لیے کہا۔ آس پاس کے سب لوگوں کا جب خون چیک ہو گیا تو صوبیدار غلام قادر نے کہا کہ اُس کا خون لے لیں۔ ڈاکٹر نے غور سے اُن کی جانب دیکھا اور پوچھا ''آپ کی عمر کتنی ہے؟''

صوبے دار نے کہا ''عمر کو چھوڑیں۔ یہ بچے کی زندگی کا سوال ہے۔''

ڈاکٹر نے پھر زور دے کر کہا ''بابا جی! ہم اصولی طور پر زیادہ عمر والوں کا خون نہیں لے سکتے۔''

بابا جی نے غصے اور کڑواہٹ سے منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا

''ڈاکٹر صاحب بھاڑ میں گئے آپ کے اصول اور بڑی عمر۔ میں اسی برس کا ہوں لیکن پھر بھی میں تم سب جوانوں سے طاقتور ہوں۔ آپ خون لینے کا بندوبست کریں۔''

بڑے ڈاکٹر اور جونیئر ڈاکٹر نے نرس کی طرف دیکھا۔ کھسر پھسر کی اور پھر صوبے دار سے کہا:

''بابا جی! آپ ایک فارم پر لکھ دیں کہ اگر خون دیتے وقت آپ کو کچھ ہو گیا تو ہسپتال کا عملہ اس کا ذمہ نہیں ہو گا۔''

صوبے دار نے پہلے سے بھی زیادہ غصے سے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''ایک نہیں دس دستخط کروا لیں۔'' اب بابا جی آپ سے تُو تک آ گئے تھے۔ میرے وقار کو بچا لے ڈاکٹر...... نثار آئے گا۔ شاہدہ پہنچے گی تو کیا کہیں گے۔ بابا جی نے وقار کا دھیان نہیں رکھا۔ جلدی کر ڈاکٹر خدا کا واسطہ جلدی کر۔''

ڈاکٹر نے رسمی کارروائی کی۔ بابا جی کے خون کا

گروپ وقار کے خون کے عین مطابق تھا۔ زیادہ وقت ضائع کیے بغیر ادھر سے خون بہہ کر وقار کی رگوں میں جانا شروع ہوگیا۔ خون لینے سے غلام قادر کا دل لڑکھڑانے لگا۔ نرس نے طاقت کی کوئی دوا اور دودھ کا ایک گلاس دیا لیکن صوبے دار صاحب چشم پوشی سے کام لیتے رہے اور بار بار وقار کی خیریت پوچھتے رہے۔

دیوار پر لٹکتے ہوئے کلاک اور صوبے دار صاحب کے دل کی ٹک ٹک دونوں ہم آواز ہورہے تھے۔ ادھر نثار قادر کے فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ آخری فون پر انہوں نے بتایا کہ بڑی سرکار کی مہربانی سے نیلی کا پیرنا گیا ہے بس پہنچنے ہی والے ہیں۔

ڈاکٹروں کی کوشش اور خدا تعالیٰ کی نظر عنایت سے وقار ہوش میں آ گیا۔ نرس بھاگتی ہوئی آئی اور صوبے دار کو بتایا:

''مبارک ہو بابا جی! اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وقار کو ہوش آ گیا ہے۔'' بابا جی خوشی سے اُچھل پڑے

''آپ تمام لوگوں کو بھی مبارک ہو بیٹی'' اس کے ساتھ ہی وہ دوڑتے ہوئے وقار کے بستر کے پاس آ پہنچے۔ وقار پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا ''بابا جی ٹیلی ویژن تو ٹھیک ہوگیا تھا۔ میں تو ویسے ہی انٹینا درست کرنے کے لیے چھت پر گیا تھا۔''

صوبے دار صاحب آگے بڑھ کر وقار کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہنے لگے ''شکر ہے رب کا میری جان...... میرے بیٹے رب کا شکر ہے۔''

وقار نے سمجھا کہ شاید بابا جی ٹیلی ویژن کے ٹھیک ہونے پر شکر ادا کر رہے ہیں۔

فوراً دروازہ کھلا۔ نثار قادر، شاہدہ اور تمام بچے وقار کے کمرے میں داخل ہوگئے۔ شاہدہ کی حالت تو ایسی تھی کہ اب گری کہ گری۔ نثار قادر کے چہرے پر غم سے کھچاؤ سا آ گیا تھا لیکن آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ وقار بچ گیا تھا۔ بچے جو ابھی تک ڈرے اور سہمے ہوئے تھے، اپنی ساری بپتا سنانے لگے کہ کیسے ٹیلی ویژن خراب ہوا۔ میکینک آیا لیکن ایک معمولی تار کی وجہ سے کام نہیں ہورہا تھا۔ بابا جی نے ٹرنک میں سے تار نکال کر دی اور ٹیلی ویژن صحیح ہوگیا لیکن سکرین پر کچھ داغ دھبے اسی طرح آ رہے تھے۔ وقار انٹینا ٹھیک کرنے کے لیے چھت پر گیا تو یہ واقعہ ہوگیا۔ اُدھر ڈاکٹر اپنی کتھا بیان کر رہے تھے کہ کیسے خون کے گروپ کی مصیبت پڑی تھی۔ آخر بابا جی کا خون کام آ گیا۔

''لیکن بابا جی کہاں ہیں'' شاہدہ نے اچانک پوچھا۔

نرس گھبرائی ہوئی آئی تو ڈاکٹر سے کہنے لگی

''ڈاکٹر بابا جی کی نبض ڈوب رہی ہے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ آ رہا ہے اور وہ سینے میں درد بھی محسوس کر رہے ہیں۔''

ڈاکٹر، نرس، نثار اور شاہدہ سب بھاگ کر بابا جی کے بیڈ کی طرف آئے اور سب سے پہلے شاہدہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چیختے ہوئے کہا:

''بابا جی! بابا جی! یہ کیا ہوگیا ہے۔ آپ نے کیا کیا۔''

''کچھ نہیں پیاری بیٹی۔ ایک پرانی چیز، نئی چیز کے کام آتی ہی رہتی ہے۔''

صوبے دار غلام قادر کی سانس اُکھڑی۔ انہوں نے ایک دو ہچکیاں لیں اور ساتھ ہی ان کا سر تکیے کی دائیں جانب ڈھلک گیا۔ ڈاکٹر دیکھتے ہی رہ گئے۔ شاہدہ نے جیسے وین شروع کر دیے۔

''ابا جی! ایسے نہ کریں۔ بابا جی رب کی قسم مجھے پرانی چیز سے بہت پیار ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے وقار نہیں، بابا جی آپ کی ضرورت ہے۔ ایک نہیں، میں پانچ وقار پیدا کر سکتی ہوں۔ پر بابا جی، میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں گی...... بابا جی...... بابا جی......''

نثار قادر آگے بڑھا۔ شاہدہ کو سنبھال کر پیچھے کیا۔ نرس کو اشارہ کیا کہ اسے سنبھالے اور پھر وہ جھکا اور بابا جی کے چہرے پر بوسے دیے۔ دوسری جانب طارق، زاہد اور کمال تمام بچے آئے اور کہنے لگے:

''وقار ضد کر رہا ہے کہ میں نے بابا جی کے پاس آنا ہے۔''

نثار نے شاہدہ کی جانب دیکھا اور کہا ''آپ اُس کے پاس جائیں۔''

شاہدہ نے چہرے کے گمبھیر بنا کر آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا ''نہیں میں نے نہیں جانا میں یہیں بابا جی کے پاس رہوں گی۔ آپ جائیں۔'' پھر بابا جی کے سرہانے سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔

''بابا جی! میں مانتی ہوں پرانی شے بہت قیمتی ہوتی ہے۔ بابا جی نہ جائیں...... بابا جی۔''

ڈاکٹر اور نرس نے شاہدہ کو کندھے سے پکڑا اور دوسرے بیڈ پر لٹا کر اُسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ شاہدہ کی آنکھیں بند ہورہی تھیں لیکن وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔

''بابا جی! پرانی شے...... پرانی شے!!!''

❀❀❀

ایک اچھے شہری کی موت

محمد یحییٰ (اومان) / ترجمہ: محمد افتخار شفیع

اچھا خاصا صحت مند آدمی تھا، گزشتہ رات چہرے سے خاصا پُرسکون دکھائی دے رہا تھا، اہل خانہ سے ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا اور پھر سو گیا۔جب صبح ہوئی تو بستر سے اٹھ نہ سکا، گھر والوں نے آ کر جگانے کی کوشش کی لیکن وہ بالکل بے حس و حرکت ہو چکا تھا۔تب جا کر اندازہ ہوا کہ یہ تو ابدی نیند سو چکا ہے۔چاشت کے وقت تک اس کی موت کی خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی۔اُن سب نے مل کر اسے غسل دیا، کفن دے کر خوشبو لگائی اور تدفین کے لیے اس کا تابوت لے کر قبرستان کی طرف چل پڑے۔سب نے مل کر اسے دفن کیا اور روتے بسورتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔

جب رات ہوئی تو اس نے قبر میں جھرجھری سی لی اور ایک دفعہ پھر زندہ ہو گیا۔اس نے بڑی احتیاط سے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی، چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔اس نے گھبرا کر اپنے بدن کو کفن سے نجات دلائی اور اپنی قبر سے باہر نکل آیا۔اب اس کا رخ قبرستان کے قریب ہی موجود شہری آبادی کی طرف تھا۔اس نے چلتے چلتے اپنے وجود پر نظر ڈالی تو ایک دم چونک گیا، وہ بالکل مادرزاد برہنہ تھا، گویا ابھی اپنی ماں کے شکم سے پیدا ہوا ہے اور اب اپنی نئی زندگی کی ابتدا کر رہا ہے۔وہ بڑے آرام سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا گھر پہنچا اور اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔صبح ہوئی تو آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔غسل خانے میں ٹھنڈے پانی کی دو بالٹیاں رکھی تھیں، اس نے جلدی سے انھیں اپنے بدن پر انڈیل لیا۔آج بڑے اہتمام سے اس نے سفید لباس پہنا اور سر پر عربوں والا مخصوص سرخ دھاری دار سکارف رکھ کے اس پر سبز رنگ کی گول پٹی جما دی۔

وہ روزانہ کے معمول کے مطابق آج بھی صبح سویرے ہی تیار ہو گیا تھا۔اس نے ہلکا پھلکا سا ناشتہ کیا اور شہر کی بڑی شاہراہ کے بارونق چوک کی طرف چل دیا جہاں اسے دفتر کی طرف جانے والی کمپنی کی بس کا انتظار کرنا تھا۔بس اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق آن کر رکی تو وہ اس پر سوار ہو گیا۔بس میں تقریباً تمام ملازمین ہی سوار تھے، زیادہ تر اپنی اپنی سیٹوں پر صبح کی ادھوری نیند پوری کر رہے تھے۔بعض کے تو خراٹوں کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔اس کی سیٹ کھڑکی کے پاس تھی، باہر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا اس کے وجود سے ٹکرائی تو اسے بھی نیند آ گئی۔کچھ دیر کے بعد بس نے کمپنی کے دفتر کے صدر دروازے پر پہنچ کر بریک لگائی۔بس میں سوار لوگ ایک ایک کر کے نیچے اترنے لگے۔بس ڈرائیور نے دیکھا کہ تمام لوگ بس سے اتر گئے ہیں لیکن ایک کاہل آدمی ابھی تک سیٹ پر بیٹھا ہوا خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے۔اس نے قریب جا کر اسے جگانے کے لیے آواز دی لیکن اس کی کوشش بے سود گئی۔اس نے آہستگی سے اس کا کندھا ہلایا لیکن یہ جان کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا کہ بس پر بیٹھا آدمی مر چکا تھا۔دوسرے ملازمین ارد گرد جمع ہو گئے۔سب نے مل کر اس کی لاش کو بس سے اتارا، اسے اندر لے گئے اور نہلا دھلا کر خوشبو لگائی۔نمازِ جنازہ پڑھنے کے بعد اس کا تابوت اٹھا کر قبرستان کی طرف چل پڑے، انھوں نے مل کر اس کی تدفین کی اور ایک دفعہ پھر گھر کو لوٹ گئے۔مرنے والا بڑا دانا شخص تھا، اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا پہلی دفعہ مرنا ایک سنگین غلطی تھی کیوں کہ ایک اچھے شہری کو دفتری فرائض کی انجام دہی کے دوران موت آنی چاہیے۔

حسن عباسی / لاہور

غزلیں، نظمیں، گیت سناتا رہتا ہوں
اہل دل کا درد بڑھاتا رہتا ہوں
بارش برسے یا پانی میں آگ لگے
میں تو اپنی دُھن میں گاتا رہتا ہوں
موسم آتے جاتے رہتے ہیں لیکن
میں اُس کی تصویر بناتا رہتا ہوں
مجھ کو خالی آنکھوں سے ڈر لگتا ہے
ان کو جھوٹے خواب دکھاتا رہتا ہوں
مایوسی کے پیڑ کے نیچے بیٹھا میں
لوگوں کو اُمید دلاتا رہتا ہوں
جن شہروں میں غم کی تجارت ہوتی ہے
اُن میں اکثر آتا جاتا رہتا ہوں
خوشحالی کی لوگ دعائیں مانگتے ہیں
میں بھی خالی ہونٹ ہلاتا رہتا ہوں
کوئی رہتا ہے میرا اُس پار حسنؔ
میں دریا میں پھول بہاتا رہتا ہوں

دودھ شریک

علی انور احمد

ہم لوگ بھٹیارے ہیں۔

میرے والدین کو بھٹیاروں کا پیشہ چھوڑے بیس بائیس برس ہو چکے ہیں۔ پھر بھی لوگ ہمیں بھٹیارے ہی کہتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمہاری ذات ہے۔ جب میں آٹھویں کے امتحان میں فرسٹ آیا اور کئی لڑکوں نے حسد کی وجہ سے مجھے دادا دایا کہہ کر چھیڑا تو میں روہانسا ہو گیا۔ اسکول سے سیدھا گھر آ کر اپنے ابا سے پوچھا کہ کیا ہماری ذات بھٹیارا ہے؟ ابا نے مجھے بتایا کہ نہیں، ذات کے لحاظ سے ہم بھٹیارے نہیں۔ یہ تو ہمارے بزرگوں کا پیشہ تھا۔ روزی روٹی کمانے کا ذریعہ تھا۔ ذات تو اپنی ہے۔

میں یہ ذات اس وجہ سے نہیں بتا رہا کہ کہیں اس ذات کے ٹھیکے دار غصہ نہ کھائیں۔ میں نے اپنے اسکول کی ایک بہت پرانی کتاب میں ایک مضمون پیشے کیسے بنے؟ پڑھا تھا جس میں بہت تفصیل کے ساتھ مختلف پیشوں اور کسب کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ انہی پیشوں کی وجہ سے لوگوں نے ذاتیں بنا ڈالیں۔ اسی وجہ سے میرا خیال ہے کہ اس مضمون کا نام ذاتیں کیسے بنیں؟ ہونا چاہیے تھا اور اب جب کوئی خاندان اپنا جدی پشتی کام یعنی پیشہ چھوڑ بھی دیتا ہے، لوگ تب بھی اسے اسی پیشے کے حوالے سے بھٹیارے، نائی، موچی اور کمہار کہتے ہیں۔ ستم ظریفی دیکھیے کہ کئی خاندان تو تین تین پشتوں سے اپنا آبائی پیشہ چھوڑ بیٹھے ہیں لیکن لوگ پھر بھی ان کی تحقیر کرنے کے لیے انہیں ترک کردہ پیشے کے حوالے سے بلاتے ہیں اور اگر کہیں وہ اپنی 'اصل ذات' بتانے کی کوشش کریں تو لوگ پیٹھ پیچھے ان پر ہنستے ہیں۔

میرے والدین مجھے بتاتے ہیں کہ وہ بھٹیاروں والا کام چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر ہوا یوں کہ میرے تایا اور تائی نے یہی کام کرنا شروع کر دیا۔ وہ جاڑوں میں بھٹی اور گرمیوں میں تنور گرم کرتے اور جو عورتیں روٹیاں لگوانے آتیں، ان سے ایک پرات کے بدلے ایک پیڑا، آٹے کے بھاڑے کے طور پر وصول کرتے۔ کڑھائی میں دانے بھونتے اور جو جنس بھونتے، اس میں سے ایک مٹھی، ایک بار کا بھاڑا رکھتے۔ کئی سیانے چنے بھنواتے اور بھاڑا گندم کا دے دیتے۔ تائے کے گھر والوں کو بظاہر اس پر اعتراض بھی نہیں تھا۔ اعتراض تو انہیں ہم پر تھا۔ وہ کہتے تھے کہ چھوٹا سا گاؤں ہے، اس میں بھٹیاروں کے دو گھر نہیں پل سکتے۔ انہوں نے میرے ابا سے کہا کہ یا تو وہ کسی اور گاؤں چلے جائیں اور یا پھر اپنی روزی روٹی کے لیے کوئی اور کام شروع کر لیں۔ محنت مزدوری کریں یا کچھ اور کریں۔ ہمارے پیشے میں حصہ نہ بٹائیں۔

دادا میرے کب کے فوت ہو چکے تھے۔ تائے کے گھر والوں نے دادی کو بھی اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا۔ دراصل میری تائی اور میری دادی کی آپس میں کبھی نہ بنی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ کہ میری دادی کو سنبھالنا بھی ابا ہی کی ذمہ داری تھی۔

میرے ابا نے بڑے بھائی کی بات مان لی یا شاید انہوں نے زبردستی منوا لی۔ اس کے بعد ہمارا جدی پیشہ تایا کے گھر والوں نے سنبھال لیا اور ابا کو دیگر کئی قسم کے چھوٹے موٹے کام کرنا پڑ گئے۔

دادی کو رکھنا ابا کے لیے نقصان کا باعث نہیں رہا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ بزرگوں کی بہت برکت ہوا کرتی ہے اور جس گھر میں بزرگ ہوں، اس گھر پر اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ میری دادی دائیوں کا کام جانتی تھیں۔ دادی سے یہ کام ان کی بہو یعنی میری تائی نے سیکھنا تھا لیکن وہ بھلا کیسے سیکھتیں۔ وہ تو بہت جلدی ساس سے علیحدہ ہو گئی تھیں۔ دادی کے اس کام نے ہمیں معاشی طور پر کافی آسودہ کر دیا۔ گاؤں اتنا بڑا نہ تھا پھر بھی مہینے دو مہینے بعد کسی نہ کسی گھر میں جاپا ہوا رہتا اور وہ بچی بچہ میری دادی ہی کی مدد سے دنیا میں آتا۔ یوں ہمیں گڑ، شکر، چاول اور گندم کے ساتھ ساتھ نقد روپے بھی مل جاتے۔ مگر یہ باتیں بہت پرانی ہیں۔ دادی کی نظر اب کمزور ہو گئی تھی۔ ہاتھوں میں وہ دم نہ رہا۔ چناں چہ یہ کام ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ یوں بھی لوگ آج کل ایڈوانس ہو گئے تھے۔ وہ پڑھی لکھی نرسیں اور دائیاں منگواتے یا پھر اس کام کے لیے سیدھے ہسپتال پہنچ جاتے۔

آج کل میرے تایا کے خاندان کا کام بھی نرم ہو گیا تھا۔ لوگوں نے گھر گھر تنوریاں اور بھٹیاں لگالی تھیں۔ اب تو لے دے کر کڑاہی تپانے والا کام ہی رہ گیا تھا۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا تھا ورنہ وہ تو شاید دانے بھی گھر ہی میں بھون لیتے۔ کڑاہی تپانے کے علاوہ شادی بیاہ ایک ایسا موقع ہوتا تھا جہاں میرے تایا کے کنبے کو چار پیسے کمانے کا موقع مل جاتا تھا۔ حالاں کہ اب لوگ دُلہن کو ڈولی میں کم ہی بٹھاتے تھے۔ گھر سے سیدھی کار میں اور وہاں سے سسرال۔ مگر پھر بھی شریف اور وضع دار گھرانے بھٹیاروں کے گھر میں لاگ ضرور بھیجتے تھے۔ کئی اکڑ بھی جاتے کہ بھلا ہم نے کہاں دُلہن کو ڈولی میں بٹھایا ہے۔

کئی گھر گاؤں چھوڑ کر شہر گئے اور یوں ہمارا گاؤں جو پہلے کتے کے قد جتنے برابر تھا، اب مرغ کے قد جتنے برابر رہ گیا۔ میرے والد نے روزی کمانے کے لیے وہ سب کام کیے جو گاؤں میں کوئی کمیں کرسکتا ہے۔ پھر ہولے ہولے ترقی ہوئی اور ہمارے گاؤں شہر کو ایک ویگن لگ گئی۔ ابا جان اس ویگن پر ہیلپر لگ گئے اور ہیلپری کرتے کرتے ڈرائیوری بھی سیکھ لی۔ ایک ویگن کے بعد دوسری ویگن لگی اور ابا اس ویگن کے ڈرائیور بن گئے۔ پھر گاؤں کے ایک پڑھے لکھے شخص نے جو کسی محکمے میں کلرک تھا، ایک کار خرید ڈالی۔ کچھ دن جھولے لینے کے بعد اس نے کار کو ٹیکسی کے طور پر استعمال کرنے کا سوچا اور یوں میرے ابا اس ٹیکسی کے ڈرائیور بن گئے۔ آج کل وہ ٹیکسی ڈرائیور ہی تھے۔

ایک دن ابا کے نام بیرون ملک سے ایک خط آیا۔ شام کے وقت ہم سب افراد کنبہ بیٹھے تو ابا نے وہ خط میرے حوالے کیا اور پڑھ کر سنانے کا حکم دیا۔ میں وہ خط پڑھ کر حیران رہ گیا۔ کسی سید محمد شفیق ہاشمی کا خط تھا۔ حیرانی والی بات یہ تھی کہ اس خط میں اس نے میرے ابا کو اپنا بڑا بھائی کہہ کر مخاطب کیا تھا اور خط کے آخر میں ''آپ کا چھوٹا بھائی سید محمد شفیق ہاشمی'' لکھا تھا۔ پہلے تو میں یہ سمجھا کہ یہ سچ مچ میرے ابا کا بھائی ہی ہے جس نے باہر کے دیس جا کر نہ صرف اپنا پیشہ بدل لیا ہے بلکہ ذات بھی بدل لی ہے۔ مگر جلد ہی میں نے اپنا یہ خیال بدل دیا۔ کیوں کہ چھوٹی عمر ہی سے مجھے علم تھا کہ میرے ابا لوگ صرف دو بھائی تھے۔ اگر ان کا کوئی تیسرا بھائی بھی ہوتا تو کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی شخص ضرور اس کا ذکر کرتا۔ یہ یقیناً ابا کا بچپن کا کوئی دوست ہے جو کافی عرصہ پہلے ملک سے باہر چلا گیا ہوگا۔ میں نے سوچا۔

''یہ جی سید محمد شفیق ہاشمی کا خط ہے۔'' میں نے ابا کو بتایا۔

''یہ کون ہے بھئی؟'' ابا نے کھانا کھاتے ہوئے پوچھا۔

''یہ تو جی آپ کو علم ہونا چاہیے۔ اس نے آپ کو اپنا بڑا بھائی کہا ہے۔''

''خط کہاں سے آیا ہے؟'' ابا نے رواداری سے پوچھا۔

''دبئی سے۔''

''دبئی سے! یہ یقیناً شپھو ہے۔'' ابا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یقیناً یہ شپھو ہی ہے۔ اس کے بارے میں سنا تھا کہ اس کا باہر کے دیس جانے کا سبب بن گیا ہے۔'' ابا اچانک خوش ہو گئے۔

''کیا لکھا ہے شپھو نے؟'' ابا بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

''وہ پاکستان آ رہے ہیں۔'' میں نے ابا کو بتایا۔ یہ سن کر ابا کو اور بھی چاؤ چڑھ گیا۔

''اماں اماں، تیرا شپھو آ رہا ہے۔'' ابا نے میری دادی کو جیسے خوش خبری سنائی۔ یہ سن کر دادی کی کمزور آنکھیں بھی ایک بار پھر چمکنے لگیں۔ ''کب آ رہا ہے میرا شپھو بیٹا؟'' اس نے خوش ہو کر پوچھا۔

دادی کو اتنا زیادہ خوش دیکھ کر مجھے ایک بار پھر اپنا خیال بدلنا پڑا۔ یہ شفیق صاحب صرف میرے ابا کے دوست ہی نہیں ہیں، بات اس سے بڑھ کر ہے۔

''کب آ رہا ہے بھئی ہمارا شپھو؟'' ابا نے مجھ سے پوچھا تو میں اپنے خیالات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ میں نے خط میں ان کے آنے کی تاریخ لکھی اور حساب لگا کر انہیں بتایا کہ کوئی دس دن بعد وہ پاکستان پہنچ جائیں گے۔

اب سید محمد شفیق ہاشمی صاحب کا انتظار شروع ہو گیا۔ دادی اماں اور ابا جی بہت خوش تھے۔ ایک دو بار سوچا کہ ہاشمی صاحب کے بارے میں ابا سے پوچھ لوں مگر پھر ارادہ بدل دیا۔ جب ابا نے کہہ دیا کہ تیرا چچا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔ چچا ہی ہوگا۔ مجھے ابا کی باتیں سن کر اتنا علم ہو چکا تھا کہ یہ شفیق صاحب ہمارے اسی گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ ابا کے گہرے دوست تھے بلکہ زیادہ تر ہمارے گھر ہی رہا کرتے تھے۔ دادی نے انھیں اپنی گود میں کھلایا تھا۔

پھر ایک دن ہمارے دروازے کے سامنے ایک کار آ کر رُکی اور اس میں سے ایک سرخ و سفید، صحت مند شخص باہر نکلا۔ اس کے چہرے پر بہت خوب صورت بھرپور کالی ڈاڑھی تھی۔ جس میں کوئی کوئی بال سفید تھا۔ ان کے پیچھے ایک عورت بھی آئی جس نے بڑی سی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ وہ یقینی طور پر میرے چچا چچی تھے۔ میں گھر میں ابا کے بعد سب سے بڑا مرد تھا۔ اس لیے میں نے آگے بڑھ کر ان دونوں کا استقبال کیا۔ ''آیئے جی آیئے خوش آمدید۔ آپ یقینی طور پر چچا شفیق ہیں۔'' میں نے احترام سے کہا۔

''اور تم یقینی طور پر میرے بھائی بشیرے کے بڑے بیٹے ہو۔'' انہوں نے ہنس کر کہا اور میرے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا۔ کون سی جماعت میں پڑھ رہے ہو؟'' انہوں نے دوبارہ پوچھا۔

''جی دسویں کا امتحان دیا ہے۔''

''واہ بھئی واہ۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔''

وہ اندر آ گئے اور چچا شفیق سیدھا میری دادی کی طرف گئے۔ انہوں نے میری دادی کے ہاتھ چومے اور میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آئے ہوئے تھے ''تم آ گئے شپھو بیٹے!'' مجھے لگا دادی کی آواز کانپ رہی تھی۔ شاید وہ بھی رو رہی تھیں۔ یا مولا

یہ کیا کہانی ہے؟ کہیں یہ سچ مچ میرے سگا چچا تو نہیں۔ جسے کسی بے اولاد سید گھرانے نے گود لیا ہو اور اس بات کا چچاشپھو کو اب پتا چلا ہو۔

''اماں میں اکیلا نہیں آیا۔ آپ کی بہو کو بھی ساتھ لے کر آیا ہوں۔'' چچا شفیق نے خاتون کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بھی آگے بڑھ کر اپنا سر میری دادی کے سامنے کر دیا۔ دادی نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور جب تسلی نہ ہوئی تو پتا نہیں کس جذبے سے ہار کر ان کا سر اپنے گلے سے لگالیا۔ پھر دادی نے ان کا سر اور ماتھا چوما۔

''جیتی رہو میری بیٹی! تمہارے سر پر سائیں کا سایہ ہمیشہ قائم رہے۔ رب تمہیں اتنا رزق دے جتنا سمندروں میں پانی ہے۔'' میری دادی کی یہ دعائیں سن کر وہ خاتون میری دادی کے ساتھ اور بھی چپک گئیں۔ بالکل فلمی سین تھا۔

''تمہارا اباپ کہاں ہے بھئی؟'' کچھ دیر بعد چچا شفیق نے مجھ سے پوچھا۔

''جی وہ شہر گئے ہوئے ہیں۔''

''شہر کیا کرنے گیا ہے؟''

''وہاں وہ ٹیکسی چلاتے ہیں۔''

''اچھا تو اس نے ٹیکسی خرید لی ہے؟''

''نہیں نہیں، ٹیکسی تو مالک کی ہے۔ ابا تو صرف ڈرائیور ہیں۔''

''یہ ٹیکسی کسی روٹ پر چلاتا ہے یا کوئی اور حساب کتاب ہے؟''

''جی وہاں تو ٹیکسی اسٹینڈ پر ہوتے ہیں۔ لوگوں کو کہیں آنے جانے کے لیے ضرورت پڑتی ہے تو لوگ ٹیکسی بک کر لیتے ہیں۔''

''یہ تو ہوائی روزی ہوئی۔ لگی لگی نہ لگی نہ لگی۔''

''بس جی ایسے ہی گزارہ ہو رہا ہے۔''

''اچھا تمہیں معلوم ہے ٹیکسی کے مالک کے ساتھ اس کا کیا حساب کتاب ہے؟''

''ہاں جی، بالکل معلوم ہے۔''

''بتاؤ تو بھلا۔''

''روز کا روز حساب ہوتا ہے۔ کل آمدنی میں سے تیل کے پیسے نکال کر باقی پیسوں میں سو میں سے پچیس روپے ہمیں ملتے ہیں۔''

چچا شفیق نے یہ سن کر لمبی سی ''ہوں'' کی۔ کچھ دیر چپ بیٹھے کچھ سوچتے رہے پھر کہنے لگے ''سنو! تمہارے ابا کے پاس نہ چلیں؟ مجھ سے اب یہاں بیٹھا نہیں جا رہا۔''

''چلیے چلتے ہیں۔ اگر وہ کہیں ٹیکسی لے کر چلے نہ گئے ہوں تب ضرور مل جائیں گے۔''

''آؤ پھر چلیں۔'' انہوں نے مجھے اشارہ کیا۔

''تم گھبرانا مت، یہاں بھابی کے پاس بے تکلفی سے بیٹھو۔ میں تمہارے جیٹھ کو لے کر ابھی آ رہا ہوں۔'' بعد والی بات چچا نے میری چچی سے کہی۔

''آپ جائیے۔ میں یہاں کوئی جھجک نہیں محسوس کر رہی۔ میرے بھائی کا گھر ہے۔'' چچی کا سبھاؤ بھی چچا کی طرح اچھا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی ہماری غربی دیکھ کر ناک نہیں سکوڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ان دونوں میں بہت ذہنی ہم آہنگی ہے۔

جلد ہی ہم دونوں چچا بھتیجا ابا کو شہر سے لے آئے۔ رات کو وہ دونوں بھائی اور تیسری میری دادی، بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پہلے تو میں سنتا رہا۔ جلد ہی مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا۔ صبح سویرے ہی چچا شفیق اور ابا دونوں کہیں چلے گئے اور شام کو بہت دیر سے لوٹے۔ دوسری رات بھی چچا شفیق ہمارے گھر رہے۔ ہم نے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی خاطر مدارات کی۔ تیسرے دن چچا شفیق صبح کا ناشتا کر کے اور ہمیں بچوں کو پیار اور پیسے وغیرہ دے کر واپس چلے گئے۔ اس دن ابا نے چھٹی کی۔ میں نے دیکھا کہ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے میری ماں سے کوئی بات کی۔ کئی سات سال بعد میں نے اپنی ماں کو بہت زیادہ خوش دیکھا۔ جانے کیا بات تھی کہ اچانک میری ماں میں بہت زیادہ تبدیلی آ گئی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی ہو گئی ہو۔ خوشی سے ماں کی ایڑیاں زمین پر نہ لگ رہی تھیں۔ میں حیران تھا کہ ہمارے گھر میں یہ کیا انقلاب آ گیا ہے۔

میں باہر سے کھیل کر آیا تو میں نے دیکھا کہ ابا ٹیکسی کو اچھی طرح دھو کر اسے کپڑے سے چمکا رہے ہیں۔ وہ بڑے پیار سے اس پر ہاتھ پھیر رہے ہیں جیسے وہ کوئی جیتی جاگتی چیز ہو۔

''ابا جی! یہ سارا قصہ کیا ہے؟'' جب میں اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکا تو میں نے پوچھ ہی لیا۔

''یہ بات آج سے کوئی چالیس سال پہلے شروع ہوئی تھی بیٹا۔'' ابا جی نے کہانی کہنے کے انداز میں بات شروع کی۔

''یہاں ایک ملوانوں کا گھر ہوا کرتا تھا۔ بابا نور محمد گاؤں کی مسجد کا پیش امام تھا۔ وہ سید بادشاہ تھے۔ بہت نیک اور پرہیزگار۔ ایک دن ان کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا اور یہ بچہ تیری دادی ہی کے ہاتھوں پیدا ہوا۔ پیدا ہوتے ہی وہ بچہ تیری دادی کے سپرد کر دیا گیا اور اسے پہلے دودھ تیری دادی ہی نے پلایا۔''

''یہ کیوں؟ اس بچے کی ماں نے اسے دودھ کیوں نہیں دیا؟ کہیں وہ......''

''نہیں نہیں وہ مری نہیں تھی۔ دراصل اس کا دودھ کڑوا تھا۔''

''کڑوا دودھ؟''

''ہاں۔ کئی ماؤں کا دودھ کڑوا ہوتا ہے۔ یہ

بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ کڑوے دودھ والی ماں اپنے بچے کو دودھ نہیں پلا سکتی۔ کیوں کہ کڑوا دودھ پی کر بچہ بیمار ہو جاتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے۔''

''انہیں کیسے معلوم ہوا کہ ان کا دودھ کڑوا ہے؟''

''دراصل علم تو انہیں پہلے بچے کی پیدائش پر ہی ہو چکا تھا۔ جب بچے نے ماں کا دودھ نہ پیا اور روتا اور ضد کرتا رہا تو پاس سے کسی سیانی بڑھیا نے مشورہ دیا کہ دودھ چیک کرو۔ لگتا ہے دودھ کڑوا ہے۔ چیک کیا گیا تو دودھ واقعی کڑوا تھا۔''

''چیک کرنے کا کیا طریقہ تھا؟''

''طریقہ بالکل سادہ ہے۔ عورتیں ایک کیڑا لے کر کسی تھالی یا پیالی میں رکھتی ہیں اور اس کیڑے میں ماں اپنے دودھ کی دھار مارتی ہے۔ اگر کیڑا جیتا رہے تو دودھ ٹھیک ہے اور اگر مر جائے تو دودھ کڑوا ہے۔''

''دلچسپ'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

''اس خاتون کو بھی پہلے بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی علم ہو چکا تھا کہ دودھ کڑوا ہے مگر وہ زیادہ پریشان نہ تھی۔ کیوں کہ دو مہینے پہلے میں پیدا ہو چکا تھا اور رب نے تیری دادی کو فالتو دودھ سے نواز رکھا تھا اور آخر کیوں نہ ہوتا۔ آخر ہم دائی حلیمہ کی اولاد میں سے ہیں۔''

''دائی حلیمہ کی اولاد؟'' میں حیران رہ گیا۔

''ہاں لوگ کہتے ہیں، وہ بھی دائی تھیں لیکن مجھے ان باتوں کا زیادہ علم نہیں۔ میں تو تمہارے چچا شپھو کی بات سنا رہا تھا۔''

''اچھا تو وہ چچا شفیق تھے؟''

''ہاں، تمہارے چچا شفیق اور ہمارے شپھو۔ دو سال تک تیری دادی نے ہم دونوں کو پیٹ بھر کر دودھ پلایا اور کبھی ناانصافی نہیں کی۔ ہمیشہ انصاف سے کام لیا۔ دودھ پلانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ شپھو ہمارے گھر کا فرد بن گیا۔ اسے تمہاری دادی کے ساتھ اپنی ماں سے بھی بڑھ کر پیار ہو گیا۔ وہ جوں جوں بڑا ہوتا گیا اس کا ہمارے گھر کے ساتھ پیار بھی بڑھتا گیا۔ کئی لوگ ہنسی ہنسی میں اسے دایا بھی کہتے۔

''مجھے پڑھنے لکھنے کا کوئی شوق نہیں تھا اور نہ ہی ہمارے گھر والوں کو پڑھائی کی ضرورت اور اہمیت کا احساس تھا۔ میں اپنے والد کے ساتھ سرکنڈے، کماد کے سوکھے پتے اور لکڑیاں لینے جانے لگا۔ ان کو جلا کر ہم تنور اور بھٹی گرم کرتے تھے۔ شپھو مسجد میں پڑھتا رہا اور اسکول بھی جاتا رہا۔ پھر وہ سارا کنبہ کسی وجہ سے وہاں سے چلا گیا لیکن ان کے بارے میں ہمیں مختلف ذرائع سے خبریں ملتی رہیں اور شپھو کے بارے میں آخری خبر یہ آئی کہ وہ دبئی چلا گیا ہے اور اب کئی برس بعد وہ ہمیں ملنے آیا تھا۔''

''اچھا تو یہ بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بتانے کو ابھی اور بہت کچھ ہے۔'' ابا نے بات دوبارہ شروع کی۔ ''شپھو جانتا تھا کہ میں غریب ہوں۔ دوسری طرف اللہ نے اس کے حالات بدل دیے تھے۔ وہ اب پیسوں میں کھیل رہا تھا۔ میرا وہ دودھ شریک بھائی تھا۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا۔ رات کو وہ مجھ سے میرے حالات پوچھتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ مالک کو دے دلا کر کچھ نہ کچھ بچ ہی جاتا ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ گاڑی کتنے کی ہے اور مالک اسے کتنے میں بیچ دے گا۔ میں نے اسے اپنا اندازہ بتایا۔ صبح ہم گاڑی کے مالک کے پاس گئے اور کچھ پیسے کم و بیش کرنے کے بعد اس سے گاڑی خرید لی۔''

''اچھا تو یہ گاڑی اب چچا شفیق نے خرید لی ہے؟'' مجھے بہت خوشی ہوئی۔

''ہاں۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میں یہ گاڑی خرید رہا ہوں۔ گاڑی بدستور تم ہی چلاتے رہو۔ سب کچھ آدھا آدھا۔ میرا حصہ جمع کرتے رہنا۔ میں تمہیں ایک اکاؤنٹ نمبر دوں گا۔ میرا حصہ ہفتے کے ہفتے اس میں ایمان داری کے ساتھ جمع کرواتے رہنا۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا، میں نے بات مان لی۔''

''آدھا آدھا؟ اب تو ہمیں بہت فائدہ ہوا کرے گا۔''

''اور آج صبح وہ گاڑی کے کاغذات ہمیں دے گیا ہے۔'' ابا جیسے کہیں دور سے بول رہے تھے۔ ''اور اس نے مجھے بتایا کہ یہ گاڑی اس نے میرے ہی نام سے خریدی ہے۔ اس نے مجھے کہا ''بشیر! اب یہ گاڑی تمہاری اپنی ہے۔ یہ ایک چھوٹے بھائی کا اپنے بڑے بھائی کے لیے معمولی سا تحفہ ہے۔''

ابا یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔ ہم دونوں کافی دیر تک چپ بیٹھے رہے۔

''ابا جی! کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ آج کل تو سگے بھائی ایک پائی نہیں چھوڑتے بلکہ کچھ نہ کچھ چھیننے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ پھر ایک سوتیلا، نہیں نہیں سوتیلا نہیں، بس دودھ شریک بھائی اتنا بڑا احسان کر سکتا ہے۔ لاکھوں کی چیز کیسے دے سکتا ہے؟''

تمہارے چچا شفیق نے ایسے ہی کیا ہے بیٹا۔''

ابا جی جذباتی ہو گئے۔

''لیکن کیوں ابا کیوں؟ انہوں نے ایسے کیسے، کس طرح اور کیوں کیا؟'' میرے لیے اپنی حیرت پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''شپھو نے یہ اس لیے کیا ہے کہ بیٹا وہ میرا صرف دودھ شریک بھائی ہے، خون شریک نہیں۔''

میرے ابا نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

سراندیپ سے سری لنکا تک

طاہر انور پاشا

سری لنکا کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ برصغیر کی۔ یہ ناشپاتی کی شکل کا جزیرہ قبل از تاریخ برصغیر کا ہی حصہ ہوا کرتا تھا۔ زمینی ساخت میں تبدیلیوں کی وجہ سے الگ ہوگیا جس کا ثبوت، چھوٹے چھوٹے جزیروں کی وہ لائن ہے جو بھارتی تکون اور اس جزیرے کے درمیان واقع ہے۔ اس کے محل وقوع کی وجہ سے لوگ اس کی مثال ہندوستان کی آنکھ سے ٹپکے ہوئے آنسو سے بھی دیتے ہیں۔ اس کے نزدیک ہی واقع ایک اور ملک، مالدیپ کی طرح اس کا نام بھی پہلے سراندیپ ہوا کرتا تھا۔ زیادہ تر عربی بولنے والے اسے اس نام سے پکارتے تھے۔ فارسی لوک ادب کے شاہکار ''سراندیپ کے تین شہزادے'' کی وجہ سے یہ انگریزی ڈکشنری میں بھی "Serendipity" کی حیثیت سے جگہ پا گیا۔ البتہ وہاں اس کا مفہوم کافی مختلف لیا گیا۔ عربوں کا اس کو سراندیپ کہنا ایک اور حوالے سے بھی ہوسکتا ہے کہ پیر سراندیپ، حضرت آدم علیہ السلام کی کنیت بھی تھی اور سری لنکا کے وسط میں آدم کی چوٹی (Adam's Peak) موجود ہے جس کے بارے میں مشہور کیا گیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام زمین پر سب سے پہلے وہاں اُترے تھے اور وہاں ان کے قدم کا نشان ابھی تک قائم ہے۔ اس بارے میں مزید تحقیق اس وقت متعارف کروائی جائے گی جب ہم ٹرین کے سفر کے دوران اس چوٹی سے پاس سے گزریں گے۔

یہاں کی تین ہزار سالہ تاریخ ریکارڈ پر ہے۔ مگر قبل از تاریخ 1,25,000 سال پرانے آثار بھی ملے ہیں۔ 29 قبل از مسیح کے بدھ مت کے کتبے دستیاب ہوئے ہیں۔ اپنے جائے وقوع اور گہری بندرگاہوں کی وجہ سے دنیا کی مشہور سلک روڈ کے ہم پلہ یہ سمندری سلک روٹ تھا۔ یورپی ممالک کی مشرق بعید اور ہندوستان سے مصالحوں اور قیمتی پتوں کی تجارت میں اس کا ہمیشہ ایک اہم مقام رہا۔ جب ان ممالک میں کالونیاں بنانے کا رواج شروع ہوا تو سپین سب سے آگے تھا۔ اُس کا زور زیادہ تر جنوبی امریکہ اور افریقہ کی جانب رہا۔ پھر اس میدان میں پرتگالی اور ولندیزی (ڈچ یا نیدرلینڈ سے متعلقہ) بھی کود پڑے۔ برطانیہ کافی دیر بعد اس طرف راغب ہوا۔

اُس وقت یہ چھوٹا سا جزیرہ جو، اب سری لنکا ہے، سراندیپ کہلاتا تھا اور سات مختلف سلطنتوں میں بٹا ہوا تھا۔ یہ سلطنتیں آپس میں ہر وقت برسرِپیکار رہتی تھیں۔ مغربی ساحلی علاقوں میں سنہالی حکومت تھی جو سیاسی عدم استحکام کا شکار تھی۔ سب سے پہلے حادثاتی طور پر پرتگالی وارد ہوئے اور کمزوری کا فائدہ اُٹھا کر چھا گئے۔ سنہالیوں کے ساتھ جنگ میں کچھ علاقوں پر قبضہ جما لیا۔ 1517ء میں کولمبو کو قلعہ بنایا اور اپنے آپ کو مضبوط کیا۔ روز روز کی لڑائیوں سے تنگ آ کر سنہالی سلطنت نے اپنا دارالحکومت ایک محفوظ مرکزی پہاڑی جگہ، کینڈی منتقل کر لیا۔ اس طرح پورے ساحلی علاقے پر پرتگیزی قابض ہو گئے۔ پوری سولہویں صدی انہوں نے وہاں حکومت کی۔ پرتگیزی میں انہوں نے اسے سیلو (Ceilao) کا نام دیا جو انگریزی تلفظ کی وجہ سے بعد میں سیلون بن گیا۔ 1602ء میں ولندیزی بھی ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی بنا کر آن پہنچے۔ کینڈی کے بادشاہ نے ان سے پرتگیزیوں کے خلاف مدد طلب کی اور ایک معاہدہ کیا کہ ان کو ساحلی علاقوں کا قبضہ واپس دلوانے کے بدلے تجارتی مراعات دی جائیں گی۔ اس معاہدے کی دونوں فریقین نے خلاف ورزی کی۔ ڈچ نے 1656ء میں کولمبو پر قبضہ کر لیا پھر آہستہ آہستہ سارے سیلون پر قدم جما لیے، سوائے کینڈی سلطنت کے، جو ایک محفوظ پہاڑی علاقے میں قائم تھی۔ 1796ء میں برطانوی مداخلت تک ان کی حکومت جاری رہی۔

جب یورپ میں نپولین نے جنگیں لڑیں اور نیدرلینڈز پر فتح حاصل کر لی تو برطانیہ کو فکر ہوا کہ کہیں ڈچ قوم سیلون کو بھی فرانس کے حوالے نہ کر دے۔ اس وقت تک برطانیہ، ہندوستان میں کافی طاقتور ہو گیا تھا۔ لہٰذا انہوں نے سیلون پر حملہ کر دیا اور بآسانی ڈچ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ بعد میں دو جنگوں کے نتیجے میں 1815ء میں کینڈی سلطنت کو بھی شکست دے کر باقاعدہ پورے سیلون پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح مقامی آبادی ایک طویل عرصہ کے لیے محکوم بن گئی۔

1815ء سے 1948ء تک تقریباً ہندوستانی ماڈل ہی چلتا رہا جس میں بے شمار ترقیاتی کام بھی ہوئے اور آزادی کی تحریکوں کا سامنا بھی رہا۔ بالکل

ہندوستان کی طرح اپنے حمایتیوں (سیلون کے غداروں) پر جاگیروں کی عنایات اور مخالفین پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹے۔ ان تحریکوں کو بیان کیا جائے تو الگ باب بلکہ کتاب کی ضرورت درپیش ہوگی۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران سیلون، جاپانیوں کے خلاف بنیادی جنگی اڈہ بنا رہا۔ تحاریک کے نتیجے میں 1947ء میں آزاد پاکستان اور ہندوستان بننے پر سیلون کی جدوجہد آزادی مزید تیز ہوگئی۔ کمزور ہوتے ہوئے برطانیہ کو مجبوری کے عالم میں سیلون کو بھی 4 فروری 1948ء کو ڈومینین کا درجہ دینا پڑا (یہی دن سری لنکا کا یومِ آزادی ہے)۔ ڈومینین، وہ ریاست ہوتی ہے جو خود مختار ہو لیکن تاج برطانیہ اور آئرلینڈ تھیں۔ انڈیا اور پاکستان بھی کچھ عرصہ ڈومینین ہی رہے۔ ڈومینین کی حیثیت تقریباً سارے ملکوں نے ختم کر لی ہوئی ہے۔ تاج برطانیہ نے عزت نفس کے لیے برطانوی کامن ویلتھ سے بھرم قائم رکھا جو جنگ عظیم دوم کے بعد برٹش امپائر ختم ہونے پر بنائی گئی تھی۔ اس میں بھی بھی 54 خود مختار ریاستیں شامل ہیں جو فاؤنڈیشن کی طرز پر غیر سرکاری تعاون کرتی ہیں۔ پاکستان، انڈیا اور سری لنکا بھی اس میں شامل ہیں۔ سرکاری طور پر صرف ان ملکوں کے باہمی سفیر، ہائی کمشنر کہلاتے ہیں۔

پاکستان نے 23 مارچ 1956ء کے دن ڈومینین کی حیثیت ختم کر لی اور قراردادِ پاکستان کے ذریعے اپنے آپ کے اسلامی جمہوریہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان کے نقش قدم پر 1971ء کی ایک تحریک کے نتیجے میں 22 مئی 1977ء کو سیلون نے بھی ڈومینین کا درجہ ختم کر کے اپنے آپ کو ایک مکمل آزاد ریاست قرار دے دیا۔ سرکاری نام ''ڈیموکریٹک سوشلسٹ ریپبلک آف سری لنکا'' رکھا گیا۔ یوں اب یہ سری لنکا کہلاتا ہے۔ 1978ء میں اس آزاد ملک کا آئین بھی بنا لیا گیا۔

سری لنکا نے کافی برے دن بھی دیکھے ہیں۔ اسے 26 سالہ خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا جو سنہالیوں اور تامل باغیوں کے درمیان 1983ء سے 2009ء تک جاری رہی۔ اس میں واضح طور پر تامل باغیوں کو ہندوستانی حمایت حاصل تھی۔ بالآخر پاکستانی فوج اور ایئرفورس کی مدد سے تامل ٹائیگرز کا خاتمہ ہوا اور ملک میں امن وامان قائم ہوا۔ سیاح اب تامل باغیوں کے گڑھ، جافنا بھی آسانی سے جاسکتے ہیں جو پہلے ایک ''نوگوایریا'' تھا۔

سری لنکا کی آبادی سوا دو کروڑ کے لگ بھگ ہے جس میں 70 فیصد بدھ مت کے پیروکار، 13 فیصد ہندو، 10 فیصد مسلم، 7.5 فیصد عیسائی اور باقی دوسرے مذاہب ہیں۔ تامل 11 فیصد آبادی کے ساتھ سب سے بڑا اقلیتی گروپ ہے۔ سری لنکا، سارک تنظیم، اقوام متحدہ، G-77 اور غیر اتحادی تنظیم کا ممبر ہے۔ ایشیا کا یہ پہلا ملک ہے جہاں عورت (مسز بندرانائیکے) حکمران بنی۔ سرکاری زبان سنہالی اور تامل ہے۔ آئینی دارالحکومت، جایا وردھنے پورا کوٹے ہے، جبکہ تنظیمی اور عدالتی امور کے لیے کولمبو ہی صدر مقام ہے۔ سرحدیں کسی ملک سے نہیں ملتیں۔ البتہ سمندر پار ہمسائے بھارت اور مالدیپ ہیں۔

✦✦✦

نعت

خزاں کشکول لے آئے اُسے برسات ملتی ہے
گداؤں کو مدینے سے بڑی خیرات ملتی ہے
کسی کی ذات پر جاں کو نچھاور کون کرتا ہے
محمدؐ کے غلاموں میں یہی بہتات ملتی ہے
زباں عجز بیاں میں نعت تک احقر کو لے آئی
کہ ایسے ہی خطاور سے نبی کی ذات ملتی ہے
ترے ملنے کی خواہش میں قمر کے روبرو ہو کر
میں آنکھیں موند لیتا ہوں مجھے جب رات ملتی ہے

صوفی محمد البصار/لاہور

✦✦✦

عاصم بخاری/میانوالی

جانِ جاں ہر اک ادا قاتل تری
ویسے تھوڑی تجھ پہ یہ دل آ گیا
تِل کیا دیکھا کسی رخسار کا
یاد تیرے ہونٹ کا تل آ گیا

....

تو نے مقبولیت کہاں دیکھی
تو یہ نکتہ سمجھ نہ پائے گا
یہ ہے عاصم بخار شہرت کا
اتنی جلدی یہ کیسے جائے گا

....

آ، اسے بھولنے کا دل سوچیں
ذہن کا مشورہ تو یہ ہی ہے
ٹھیک تھا میرے بس میں ہوتا تو
دل کہے مسئلہ تو یہ ہے

....

مجھ سے طاقت میں کب زیادہ تھا
سوچتا ہوں میں کس طرح ہارا
تیر تلوار سے کہاں، اس نے
مجھ کو حسنِ سلوک سے مارا

عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط، ظروف نگار اور استاد فن **منشاء یاد** سے گپ شپ

تحریر: عامر بن علی/ جاپان

سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سخن فہم ہونے کے ساتھ ساتھ غالب کے طرفدار بھی ہیں۔ عالمی شہرت یافتہ مصور، خطاط اور ظروف نگار منشاء یاد کا نام آرٹ سے وابستہ لوگوں کے لئے جانا پہچانا اور معتبر ہے۔ میری ان سے ایک خصوصی نسبت بھی ہے اور وہ یہ کہ میاں چنوں ہم دونوں کی مشترکہ جنم بھومی ہے۔ کئی عشروں سے منشاء یاد کیلی گرافی، پورٹریٹ، سکیچز، بلیو پوٹری اور دیگر متعدد شعبہ ہائے فن میں اپنا تخلیقی سفر بڑی شد ومد اور محنت و محبت سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا ارتقائی سفر ہماری آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور اپنی ارتقائی منازل طے کرتا ہوا اب اوج کمال پر پہنچ چکا ہے۔ مقامی، قومی اور عالمی سطح پر ان کے فن پاروں کی بے شمار نمائشیں منعقد ہو چکی ہیں۔ بلا مبالغہ دنیا کے درجنوں ممالک کی اہم دیواروں پر ان کے فن پارے آویزاں ہیں جو ان کے فن کی عظمت کی گواہی دیتے ہیں۔ گرچہ ابتدائے سفر میں وہ پہلے پہل خود ہی کوشش کرتے رہے، پھر معروف خطاط اظہر قلمکار کی شاگردی اختیار کر کے ایک سال تک ان کے ہمراہ کام کرتے اور سیکھتے رہے۔ پھر ایک سال فلموں کے پوسٹر بناتے رہے۔ مگر اس تمام عرصے میں انہیں احساس ہوتا رہا کہ یہ ان کی منزل اور منشاء نہیں ہے۔ کالج ایف ایس سی کے دوران شروع ہونے والا یہ سفر جب وہ ساہیوال میں گریجوایشن کر رہے تھے تب بھی جاری و ساری رہا اور ایم ایس سی شعبہ شماریات میں ان کی صلاحیتیں مزید نکھر آئیں۔

اسلامک خطاطی کی جانب ان کا رجحان تو ابتدائے سفر فن سے ہی تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ انہوں نے محسوس کیا کہ یہی ان کا اصل خداداد تحفہ اور صلاحیت ہے۔ مقابلے کا امتحان پاس کرنے سے پہلے وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ تھے اور پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیابی کے بعد بھی ان کا تعلیم کے شعبہ سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ مگر ان کا اصل تخلیقی جوہر اور جذبہ جنون قلم اور موئے قلم سے جڑا ہوا رنگوں اور کینوس سے متعلق ہی رہا۔ ان کے تخلیقی سفر میں ایک اہم موڑ ظروف نگاری کی طرف آیا۔ ملتان کی تاریخی اور روایتی نیلے رنگوں کی مشہور زمانہ بلیو پوٹری و سرامک کو انہوں نے اسلامک خطاطی سے ہم آہنگ کر کے اک نیا تخلیقی رچاؤ پیدا کیا ہے۔ یہ ان کی اپنے فن سے کمٹمنٹ ہی تھی جس نے انہیں فن خطاطی میں استعمال ہونے والے تمام اہم خطوط سیکھنے پر آمادہ کیا۔ ان کے فن پارے دیکھیں تو آپ کو خط ثلث، خط کوفی، خط نسخ، خط شکستہ، خط رقعہ اور خط دیوانی میں ان کا کیا ہوا خوبصورت تخلیقی کام نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ انہی خطوط کو برش اور کینوس پر فقط رنگوں سے آرٹ کا شاہکار نہیں بنایا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ سرکنڈے کے قلم اور قرطاسِ ابیض پر بھی ایک سے بڑھ کر ایک تخلیقی نمونہ ان کی آرٹ گیلری میں ملتا ہے۔ کورین آرٹ میں اسکرین پرنٹنگ میں بڑا تخلیقی کام ہوتا ہے، منشاء یاد نے اس شعبۂ فن میں بھی بہت کام کیا اور کمال مہارت حاصل کی ہے۔ قرآنی آیات کی خطاطی سے انہیں خصوصی لگاؤ ہے اور ان کا یہ فن خیرہ کن ہے۔ 2003 میں خانہ فرہنگ ایران کی جانب سے منعقدہ نمائش میں انہوں نے حصہ لیا اور بہترین آرٹسٹ کا ایوارڈ جیت لیا۔ جب کہ الحمراء آرٹس کونسل میں منعقد ہونے والی متعدد نمائشوں میں بھی بارہا حصہ لیا اور انعامات حاصل کیے۔ کئی برادر اسلامی ممالک کے سفارتخانوں کے لئے ان سے اسلامی خطاطی کے نمونے بنوائے گئے۔ ایران و عرب میں ان کے فن کو بہت پذیرائی ملی ہے۔

منشاء یاد کا فن پاکستان کا فخر اور نشان ہے۔ ارباب اقتدار اور حکومت کے ذمہ دار اہلکاروں کو چاہیے کہ ان کے تخلیقی کام کو سرکاری سرپرستی فراہم کریں۔ سفارت خانوں اور دیگر اہم سرکاری دفاتر میں ان کے فن پارے سجانے کے قابل ہیں۔ ان کا فن ہماری ثقافت اور فنکارانہ عظمت کا بھی ثبوت ہے، نگار خانوں اور عجائب گھروں میں ان کا کام پہنچائے جانے کا حق دار ہے۔ یہ منشاء یاد کے اعتراف فن تک محدود بات نہیں ہے بلکہ نوجوان نسل کو ایک مثبت جہت سے روشناس کرانے کی کوشش بھی ہے۔ ایسی ہی کوشش میاں چنوں میں آرٹ گیلری کی صورت میں انہوں نے پیش کی ہے، جس کا مقصد نوجوان نسل کی رہنمائی کے علاوہ اسلاف کی درخشندہ روایات کی آبیاری بھی ہے۔

بقیہ انٹرویو: نصیر احمد ناصر

سوال 1: اپنے بارے میں بتایئے، تعلیم، پیشہ، خاندانی پس منظر اور اپنی جائے پیدائش کے بارے میں۔

جواب: اپنے بارے میں بتانے کے لیے میرے پاس کچھ خاص نہیں۔ میں یکم اپریل 1954ء کو پنجاب کے ضلع گجرات تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں ناگڑیاں میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق ایک متوسط زمیندار جٹ گھرانے سے ہے۔ گاؤں میں اُس وقت نہ بجلی تھی نہ سڑک گاؤں تک جاتی تھی۔ کئی میل پیدل چلنے کے بعد سڑک آتی تھی۔ صرف لڑکوں کا ایک پرائمری اسکول تھا۔ میں تیسری جماعت تک گاؤں میں رہا پھر کھاریاں آ گیا جہاں ہائی اسکول تھا اور کھاریاں کینٹ میں ڈگری کالج تھا۔ زندگی کا طویل عرصہ کھاریاں میں گزرا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق کھاریاں اسکول سے ہوا۔ لکھنا بھی وہیں کالج کے زمانے سے شروع کیا۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں۔ ملازمت کا آغاز اسلام آباد ایک پرائیویٹ ادارے سے کیا۔ کچھ سال بیرون ملک بھی رہا۔ دس سال میرپور آزاد کشمیر رہا جہاں شریک حیات آزاد کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں۔ 2002ء میں راولپنڈی آ گیا۔ یہیں اپنا گھر بنایا اور اب مستقل یہیں رہائش پذیر ہوں۔

سوال 2: نثری نظم آپ کا معتبر حوالہ ہے آپ نے اصنافِ سخن میں سے اس کا انتخاب ہی کیوں کیا؟

جواب: آپ کا یہ سوال یا قیاس بنیادی طور پر درست نہیں۔ میں نے کالج کے زمانے سے لکھنے کی ابتدا ہلکے پھلکے مضامین، غزلوں اور افسانوں سے کی جو اُس وقت کے اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ کیونکہ میرا بچپن گاؤں میں گزرا تھا اور فطرت میرے اندر ایک بڑی نظم کی صورت جاگزیں تھی۔ اس لیے نظم نگاری کی طرف میرا رجحان قدرتی تھا اور ابتدا ہی سے میں نے نظم نگاری کو مستقل ذریعہء اظہار بنا لیا تھا۔ 1974 / 75ء سے میری نظمیں اور غزلیں اُس دور کے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اسی (80) کی دہائی میں جب میں اسلام آباد میں تھا تو روزنامہ جنگ کے ادبی صفحہ میں میری نظمیں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔ آپ کو شاید علم نہیں کہ میرا بنیادی حوالہ آزاد نظم ہے اور مجموعی طور پر میری معرا اور آزاد نظموں کی تعداد نثری نظموں کی نسبت زیادہ ہے۔ ستر (70) کی دہائی میں نثری نظم کا بڑا فیشن تھا تو میرا بھی جی چاہتا تھا کہ نثری نظم لکھوں لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ نظم خود بخود ردھم اور میٹر میں ہو جاتی تھی۔ تاہم گاہے گاہے نثری نظمیں بھی ہوتی رہیں۔ اب تک میری آزاد یعنی میٹر والی نظموں کے چار مجموعے (1) پانی میں گم خواب، (2) عرابچی سو گیا ہے، (3) ملبے سے ملی چیزیں اور (4) زرد پتوں کی شال (مختصر نظمیں/ ہائیکو) شائع ہو چکے ہیں جبکہ نثری نظموں کے دو مجموعے (1) تیسرے قدم کا خمیازہ اور (2) سرمئی نیند کی بازگشت شائع ہوئے ہیں اور تیسرا "محبت کا سائیڈ پوز" زیر ترتیب ہے۔ نظمو کے انگریزی تراجم بھی شائع ہو چکے ہیں۔ غزلیں بھی کافی لکھی ہیں لیکن غزلوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ کچھ غزلیں ضائع ہو گئیں کچھ خود ڈسکارڈ کر دیں لیکن پھر بھی اتنی غزلیں ہیں کہ ایک مجموعہ آسانی سے بن سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا نہیں کہ میرا حوالہ نثری نظم ہے۔ میرا حوالہ نظم ہے جس میں نظم کی تمام ہیئتیں آ جاتی ہیں۔

سوال 3: شاعری کی دوسری اصناف میں کیسا کام ہو رہا ہے؟

جواب: اس وقت غزل اور نثری نظم زیادہ لکھی جا رہی ہے۔ نوجوان نسل بھی انہی دو اصناف کی طرف زیادہ مائل ہے۔ شاعری کی دیگر اصناف ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ نئے تجربے بھی مستقل جڑ پکڑنے میں ناکام ہیں۔ دلچسپ یہ ہے کہ لڑکے زیادہ تر غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں اور لڑکیاں نثری نظم کی طرف۔ نوجوانوں میں غزل کی زیادہ تر شاعری پرفارمنس یعنی مشاعرے، یوٹیوب اور ٹک ٹاک کی شاعری بن کر رہ گئی ہے۔ نثری نظم میں بھی یہی صورتِ حال ہے۔ زبان و بیان، محاورے، گرامر، فصاحت و بلاغت اور دیگر شعری عناصر اور فنی محاسن کا کم ہی خیال رکھا جاتا ہے۔ بے جا لفاظی سے کام لیا جاتا ہے جو میری نظر میں شاعری کی خوبی نہیں خامی ہے۔ سوشل میڈیا کی پذیرائی نے سب کو تن آسانی اور سطحی پن میں مبتلا کر دیا ہے۔

سوال 4: اُردو ادب میں اب تک نثری نظم پر کتنا اور کیسا کام ہوا ہے یا ہو رہا ہے؟

جواب: میرا خیال ہے کہ نثری نظم اب اس نوع کے

بنیادی سوالات اور مباحث سے آگے نکل آئی ہے اور نظم کی دیگر ہیئتوں پابند، معریٰ اور آزاد نظم کی طرح نثری نظم بھی اب نظم کی ایک باقاعدہ ہیئت کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ تمام تر رطب و یابس کے باوجود اردو میں بہت اعلیٰ اور عالمی معیار کی نثری نظمیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

سوال 5: نثری نظم کا کیا مستقبل ہے؟ کیا اسے سنجیدہ حلقوں میں پذیرائی حاصل ہے؟

جواب: یہ آج سے بیس پچیس سال پہلے کا سوال ہے۔ نثری نظم کا حال بھی اور مستقبل بھی تابناک ہے۔ میں نے بیسویں صدی کے اواخر میں کہہ دیا تھا کہ مستقبل نثری نظم کا ہے جو آج سچ ثابت ہو رہا ہے۔ 1990ء تک ڈر ڈر کر نثری نظم لکھنے والے اب کھل کر اس میں بہترین اظہار کر رہے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی "فنون" میں نثری نظم شائع نہیں کرتے تھے لیکن ان کے نواسے اب شائع کرتے ہیں۔ وزیر آغا صاحب بھی بالآخر اپنے "نثرِ لطیف" والے دیرینہ موقف سے دستبردار ہو گئے تھے۔

سوال 6: تسطیر کا خیال کیسے آیا؟ نثری نظم والوں کے لیے تسطیر نے جو پلیٹ فارم مہیا کیا اس سے کتنے مطمئن ہیں؟

جواب: تسطیر ایک دیرینہ خواب تھا۔ ایک ایسا ادبی رسالہ جو صحیح معنوں میں اردو ادب کا نمائندہ ہو گروہ بندی سے آزاد ہو اور جس میں ہر اسکول آف تھاٹ کے لکھنے والے موجود ہوں یہ خواہش ابتدائی ادبی زندگی میں ہی دل میں جگہ بنا چکی تھی لیکن اس کا اجرا اُس وقت کیا جب مَیں ادب میں اپنی ایک انفرادی شناخت بنا چکا تھا۔ اس لیے کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے رسالے کو اپنی شناخت کے لیے استعمال کیا ہے۔ 1997ء کے آغاز میں جب تسطیر کا اجرا ہوا تو اس کا اولین مقصد ادبی گروہ بندیوں اور اُردو شعر و ادب پہ طاری جمود اور یکسانیت کو توڑنا اور اسے معاصر ادب کا ایک رجحان ساز جریدہ بنانا تھا۔ ایک ایسا جریدہ جس میں ادب کی روحِ عصر ہو، پرانے، معاصر اور نئے لکھنے والوں کا متوازن امتزاج ہو اور جس کا مزاج علاقائی نہیں عالمی ہو۔ تسطیر کی اشاعت نہ تو کسی رسالے کا خلا پُر کرنے کے لیے، نہ کسی رسالے کے تتبع یا مسابقت میں اور نہ کسی ادبی، سماجی اور مالی منفعت کے لیے شروع کی گئی تھی۔ تسطیر کی اپنی ادبی روحانیات، اپنی ادبی حرکیات ہیں جو کسی مخصوص ادبی گروپ، کسی مخصوص ادبی شخصیت، کسی مخصوص نقاد، کسی مخصوص تبصرہ و کالم نگار کی محتاج نہیں۔ جہاں تک سوال کے دوسرے حصہ کا تعلق ہے تو تسطیر نے صرف نثری نظم نگاروں کو پلیٹ فارم مہیا نہیں کیا بلکہ ادب کی تمام اصناف کو اور پرانے، معاصر اور نئے اور ہر طبقہء فکر کے لکھنے والوں کو برابر اور متناسب جگہ دی۔ تسطیر اس مقصد میں نہ صرف کامیاب رہا بلکہ ایک رُجحان ساز رسالہ ثابت ہوا ہے۔ تسطیر کے بعد میں آنے والے ہر ادبی رسالے نے اسی کے انداز اور طرز کو اپنایا۔ تسطیر صرف نامور لکھاریوں کا رسالہ نہیں بلکہ اس میں نئے لکھنے والوں کو بھی اہمیت دی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاصر اور مُستقبل کے رُجحانات کا رسالہ ہے۔ تسطیر کے پہلے دور کے اداریوں نے کئی نئے مباحث چھیڑے جن پہ اپنے وقت کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے حصہ لیا۔ تسطیر کے پہلے دور میں نئی نسل کی رہنمائی اور آزاد نظم اور نثری نظم میں فرق واضح کرنے کے لیے اور نصابی ضرورت کے تحت نظم اور نثری نظم کے الگ الگ حصے ہوتے تھے۔ لیکن اب نظم کا ایک ہی سیکشن ہوتا ہے جس میں پابند، معریٰ، آزاد اور نثری یعنی نظم کی تمام ہیئتیں شامل کی جاتی ہیں۔ دنیا بھر میں نظم اب میٹر کے بغیر ہی لکھی جاتی ہے، آزاد نظم اور نثری نظم کی کوئی تخصیص نہیں رہی۔ نظم سے مراد نظم ہے چاہے وہ نثری ہو یا آزاد۔ زیادہ تر ادبی رسالوں میں نثری نظم بھی اب نظم کے سیکشن میں شائع کی جاتی ہے۔

سوال 7: کچھ لوگ نثری نظم کو شاعری کا خام مال کہتے ہیں، آپ کیا کہیں گے؟

جواب: یہ بڑا عجیب سا سوال ہے۔ شاعری یا ادب کی ہر صنف کسی نہ کسی خام مال کی پیداوار ہوتی ہے۔ یہ خام مال تجربہ، مشاہدہ، مطالعہ ہو سکتا ہے۔ اردگرد کی حقیقی زندگی ہو سکتی ہے، تخیل ہو سکتا ہے۔ دنیا میں پیش آنے والے عظیم سانحات و واقعات ہو سکتے ہیں، جنگیں اور وبائیں ہو سکتی ہیں۔ مختلف نوع کے علوم اور کائناتی اسرار ہو سکتے ہیں۔ یا یہ سب مل کر شعر و ادب کا خام مواد مہیا کرتے ہیں جنہیں لکھنے والے اپنے داخل کی ریفائنری میں لے جاتے ہیں اور پھر اپنی اپنی تخلیقی استطاعت کے مطابق انہیں ارفع و اعلیٰ فن پاروں میں ڈھالتے ہیں۔ شاعری چاہے کسی بھی ہیئت میں ہو ادب کی ارفع ترین صنف ہے۔ تاہم یہ ہر شاعر کا اپنا اپنا زائدہ ہوتا ہے کہ وہ کس معیار یا ترفع کے کس درجہ کا شعری پروڈکٹ لاتا ہے۔ اس کی مثال آئل ریفائنری کی سی ہے جہاں خام تیل سے ہائی اوکٹین بھی بنتا ہے، پیٹرول بھی، ڈیزل بھی اور اسی سے لُک (Bitumen) بھی بنتی ہے۔

سوال 8: اپنی ادبی زندگی کے سفر کی روداد بتائیے۔

جواب: یہ ایک طویل داستان ہے۔ اسے کسی فارغ وقت کے لیے اٹھا رکھیے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں عام طور پر انٹرویو نہیں دیا کرتا۔ پچاس سالہ ادبی زندگی میں شاید ایک دو بار انٹرویو دیئے ہوں وہ بھی بصد شوق نہیں بصد اصرار۔ یہ انٹرویو بھی اچانک اور فوری نوعیت کا ہے آپ نے وقت نہیں دیا اس لیے جو ذہن میں آیا عموی جوابات دے دیئے ہیں۔

سوال 9: کیا جدید نظم پر مغرب کے اثرات ہیں یا یہ ہماری روایات کی پاسداری بھی نظر آتی ہے؟

جواب: آپ نے جدید نظم کہا ہے تو نظم میں جدت اور قدامت کا قضیہ ایک الگ موضوع ہے میں اپنے ایک اداریے میں اس پر مفصل لکھ چکا ہوں۔ اردو نظم اب ہماری سرزمین ہماری مٹی میں جڑیں پکڑ چکی ہے اور اس میں ہماری روایات کی پاسداری با آسانی دیکھی جا سکتی ہے۔ برآمدی صنف ہونے کے باوجود اردو نظم میں اب مقامیت کا عنصر آ چکا ہے اور اسے عالمی تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے بس سکہ بند نقادوں کی مخصوص بصارت سے ہٹ کر تھوڑی سی ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔

سوال 10: بڑے ادیب یا شاعر میں کیا خصوصیات ہونی چاہیے؟

جواب: تخلیقی سچائی۔ انعام و اکرام، اعزازات اور شہرت و پذیرائی سے بے نیاز ہو کر لکھنا۔ اس کے بغیر کوئی ادیب یا شاعر خود ساختہ بڑا تو ہو سکتا ہے حقیقی معنوں میں بڑا نہیں ہو سکتا۔ ویسے میں اس "بڑے" کی اصطلاح سے اتفاق نہیں کرتا۔ یہ ایک اضافی اصطلاح ہے۔ دنیا میں ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ لکھنے والے تھے، ہیں اور آتے رہیں گے۔ کون کس سے، کتنا بڑا ہے اس کا فیصلہ وقت کرتا ہے ہم خود نہیں کر سکتے اور وقت ایک حتمی نہیں جاری و ساری فنامنا ہے۔

سوال 11: ادبی تحاریک نے ادب پر کیا اثرات مرتب کیے؟ اب کوئی بڑی ادبی تحریک کیوں جنم نہیں لے رہی؟

جواب: اس سوال کا پہلا حصہ کوئی سینس نہیں رکھتا کیونکہ کوئی بھی ادب تحریک تب ہی بنتا ہے جب وہ کچھ اثرات رکھتا ہے۔ دوسرے حصے کے جواب میں عرض ہے کہ بڑی ادبی تحریکیں دنیا میں رونما ہونے والے بڑے بڑے حادثات، واقعات، سانحات، بڑی جنگوں، وباؤں اور بڑی ایجادات سے جنم لیتی ہیں۔ جیسے پہلی اور دوسری عالمی جنگوں نے اور اسٹیم انجن اور ایٹم بم کی ایجاد نے مغربی ادب پر دور رس نتائج ڈالے۔ برصغیر کی حد تک دیکھا جائے تو اردو ادب ابھی تک تقسیم ہند کے دبدبے سے باہر نہیں آ سکا۔ اس کے بعد دنیا کئی بڑے سانحات و واقعات اور تبدیلیوں سے دوچار ہو چکی ہے۔ روس کی نظریاتی اور سرحدی شکست و ریخت، گلف وارز، نائن الیون، دوسری عرب سپرنگ، افغانستان، طالبان، داعش، اسلاموفوبیا، موبائل، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، توانائی کا بحران، گلوبل وارمنگ، ملٹائی نیشنل فنامنا، حالیہ برسوں میں کرونا کی وبا وغیرہ وغیرہ۔ ان سب کا شعر و ادب اور زبان و ثقافت پہ اثر انداز ہونا ایک قدرتی عمل ہے۔ لیکن آپ کا یہ کہنا درست ہے کہ اردو ادب میں کسی بڑی ادبی تحریک کے آثار ابھی تک دکھائی نہیں دیتے۔ بڑی بڑی ایجادات تو ہو چکی ہیں آگے انہی کی توسیع و ترقی ہے۔ ادب کو شاید کسی بڑے سانحے کا انتظار ہے۔

سوال 12: زمانہ حال میں ادب کی کیا اہمیت ہے؟

جواب: ادب کی اہمیت ہر دور میں رہتی ہے۔ انسان کتنی بھی مادی ترقی کر لے اسے کسی نہ کسی روحانی اور فکری پناہ گاہ کی ضرورت رہتی ہے۔ شاعری اور ادب اس کی یہ ضرورت پوری کر سکتا ہے۔ کارل یونگ نے اپنی کتاب 'ماڈرن مین ان سرچ آف سول' میں لکھا ہے کہ شاعر (یہاں شاعر کے ساتھ ادیب کا بھی اضافہ کر لیں) کا کام ہے معاشرے کی روحانی ضروریات کو پورا کرے۔ اگر ہم روحانی ضروریات کو وسیع تر مفاہیم میں پھیلا کر دیکھیں تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی قوم کی نفسیاتی و معاشرتی صحت کا دارومدار اس قوم کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں کی سچائی اور سماجی انصاف سے وابستگی اور اظہار کی طاقت پر ہے۔ لیکن معیشت کی طرح یہ ادب میں بھی کساد بازاری کا دور ہے۔ یہ ایک گلوبل فنامنا ہے۔

سوال 13: ادب کے قارئین کے لیے کوئی پیغام

جواب: کتابیں اور ادبی رسالے خرید کر پڑھیں۔ کھانے پینے کے بجٹ کے ساتھ کتابوں کا بجٹ بھی رکھیں۔ خاص طور پر شاعری کی کتابوں کو خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ اس طرح اچھی شاعری کے احیا میں مدد ملے گی۔

✦✦✦

مختصر ادبی خبریں

☆ ممتاز شاعر، ڈرامہ نگار، کالم نگار اور دانش ور امجد اسلام امجد کی یاد میں تعزیتی ریفرنس اکادمی ادبیات اسلام آباد کے کانفرنس ہال میں منعقد ہوا۔ مجلس صدارت میں انور مسعود، افتخار عارف اور کشور ناہید شامل تھیں۔ ابتدائی کلمات ڈاکٹر یوسف خشک چیئر مین اکادمی ادبیات پاکستان نے ادا کیے۔ ملک اور بیرونِ ملک سے نامور ادیبوں نے اظہارِ خیال کیا۔

☆ افوش کلب فالکن لاہور میں ادارہ تخلیق کی جانب سے گیارہویں سالانہ ادبی تقریب کا انعقاد کیا گیا جن میں نمایاں ادبی خدمات سرانجام دینے والی شخصیات کو ایوارڈ دیے گئے۔ تقریب کی صدارت اصغر ندیم سید نے کی۔ تقریب میں محمد حنیف باوا، ڈاکٹر خواجہ ذکریا، نذیر قیصر، سونان اظہر جاوید، ڈاکٹر سعادت سعید، محمود احمد قاضی، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر قیصر رفیق، ناصر علی سیّد، ڈاکٹر ہارون رشید تبسم اور دیگر نامور شخصیات نے شرکت کی۔

☆ بزم علم وفن (ہزارہ) کے زیر اہتمام سہیل احمد صمیم کے نعتیہ مجموعے ''الی النورؐ'' کی تقریب رونمائی 15 اپریل 2023ء کو ماڈرن ایج پبلک سکول اینڈ کالج (بوائز کیمپس) ایبٹ آباد میں منعقد ہوئی۔ صدارت جناب امان اللہ خان امان نے کی۔ مہمانِ اعزاز پروفیسر ڈاکٹر سعید اقبال شاہ تھے۔ جبکہ احمد ریاض اور امین صادق نے مقالے پیش کیے۔ تقریب کا دوسرا دور نعتیہ مشاعرے پر مشتمل تھا۔ جس میں شعرائے کرام نے اپنا نعتیہ کلام پیش کیا۔

☆ ڈاکٹر اشرف کمال اور شیر علی کی جانب سے اُردو زبان و ادب کے ممتاز دانش ور نقاد، محقق، اُستاد پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار چیئر مین شعبہ اُردو استنبول یونیورسٹی ترکی کے اعزاز میں افطار ڈنر کا اہتمام اسلام آباد کلب میں کیا گیا جس میں پروفیسر جلیل عالی، ڈاکٹر شکیل روشن، ڈاکٹر یوسف خشک، محمد حفیظ خان، محمد حمید شاہد، منظر نقوی و دیگر کے علاوہ ترکیہ ایمبسی کے مہمانوں نے بھی بطورِ خاص شرکت کی۔

☆ اُستاد دامن۔ ایک روزہ سیمینار 13 اپریل 2023ء کو پنجاب کونسل آف آرٹس (فیصل آباد) اور گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی فیصل آباد کے اشتراک سے منعقد ہوا۔ صدارت جناب افتخار عارف نے کی۔ مہمانانِ خصوصی پروفیسر جلیل عالی جبکہ مہمانانِ اعزاز حفیظ خان اور ڈاکٹر شیر علی تھے۔

☆ 7 اپریل 2023ء کو آرٹس کونسل کراچی کے زیر اہتمام نعتیہ مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں نامور شعرائے کرام نے شرکت کی اور اپنا نعتیہ کلام آقائے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کی بارگاہ میں مکمل عقیدت سے پیش کیا۔

☆ نجم فیلوز اور ابوالحسن خاور کی میزبانی میں لاہور میں نعتیہ مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت صادق جمیل نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں سید سلمان گیلانی، غلام محی الدین جبکہ مہمانانِ اعزاز میں سعود عثمانی اور واجد امیر تھے۔ مہمان شعراء رحمان فارس، صابر رضوی، حسان المصطفیٰ، سید اعجاز حسین عاضر، مظہر الحق، احسان علی حیدر، نیلم ملک، رقیہ غزل، نوشین فاطمہ اور ردائے زینب شاہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

☆ ''اسلوب انٹرنیشنل'' کے زیر اہتمام معروف شاعر و محقق نوید صادق کی کتاب ''مسافت'' کی تقریب پذیرائی آیان پیلس بحریہ ٹاؤن میں ہوئی تقریب کی صدارت ڈاکٹر خورشید رضوی نے کی۔ مہمانِ خصوصی پشاور سے معروف ادیب وصحافی ناصر علی سید تھے۔ جبکہ اسلام آباد سے معروف مزاحیہ شاعر ڈاکٹر عزیز فیصل اس تقریب کے مہمانِ اعزاز تھے۔ تقریب کے بعد مشاعرے کا اہتمام یا گیا جس میں ناصر علی، ڈاکٹر یونس خیال، ڈاکٹر شاہد اشرف، توقیر عباس، ندیم آکاش، عمران اعوان، فرح رضوی، زعیم رشید، شاہد فرید، بشیر احمد حبیب، ساحل نظامی، ڈاکٹر ندیم اکبر ندیم، سجاد حسین ساجد، توقیر احمد نے اپنا کلام پیش کیا۔

☆ کھوئہ لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام کھوئہ میں 8 اپریل 2023ء کو ایک خوب صورت مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ تقریب میں کھوئہ کے تین شعراء کی سالگرہ کا کیک بھی کاٹا گیا جن میں جاوید احمد، نوید فداستی اور وقاص امیر شامل ہیں، ظہیر راجہ نے نظامت کے فرائض بہت احسن طریقے سے نبھائے۔ مشاعرے میں ممتاز شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا۔ اُردو نظم کے مایہ ناز شاعر ڈاکٹر وحید احمد کی شرکت نے مشاعرے کو یادگار بنادیا۔

❀❀❀

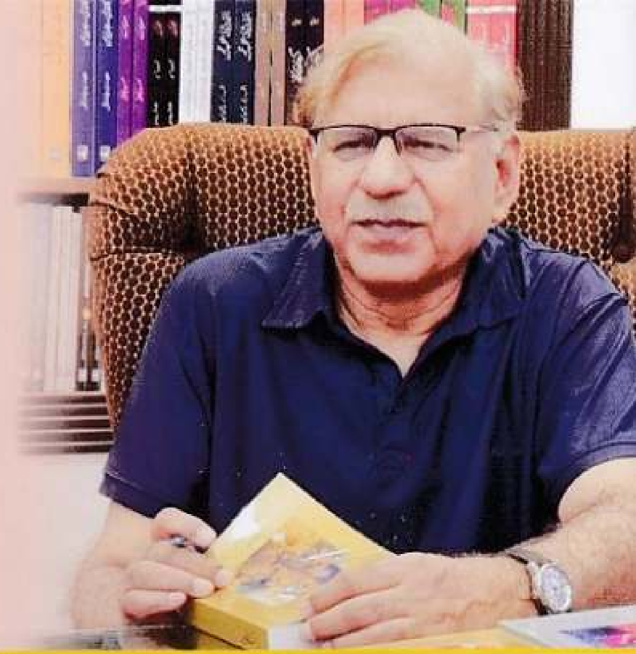

اردو ادب ابھی تک تقسیمِ ہند کے دبدبے سے باہر نہیں آسکا

نامور ادیب

نصیر احمد ناصر

سے مدیرہ ارژنگ لبنیٰ صفدر کا مکالمہ

اردو نظم اب ہماری سرزمین اور ہماری مٹی میں جڑیں پکڑ چکی ہے

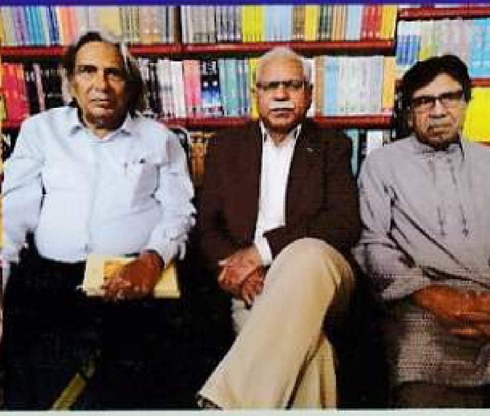

سوال 1: اپنے بارے میں بتایئے، تعلیم، پیشہ، خاندانی پس منظر اور اپنی جائے پیدائش کے بارے میں۔

جواب: اپنے بارے میں بتانے کے لیے میرے پاس کچھ خاص نہیں۔ میں یکم اپریل 1954ء کو پنجاب کے ضلع گجرات تحصیل کھاریاں کے ایک گاؤں ناگڑیاں میں پیدا ہوا۔ میرا تعلق ایک متوسط زمیندار جٹ گھرانے سے ہے۔ گاؤں میں اُس وقت نہ بجلی تھی نہ سڑک گاؤں تک جاتی تھی۔ کئی میل پیدل چلنے کے بعد سڑک آتی تھی۔ صرف لڑکوں کا ایک پرائمری اسکول تھا۔ میں تیسری جماعت تک گاؤں میں رہا پھر کھاریاں آ گیا جہاں ہائی اسکول تھا اور کھاریاں کینٹ میں ڈگری کالج تھا۔ زندگی کا طویل عرصہ کھاریاں میں گزرا۔ کتابیں پڑھنے کا شوق کھاریاں اسکول سے ہوا۔ لکھنا بھی وہیں کالج کے زمانے سے شروع کیا۔ میں پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہوں۔ ملازمت کا آغاز اسلام آباد ایک پرائیویٹ ادارے سے کیا۔ کچھ سال بیرون ملک بھی رہا۔ دس سال میرپور آزاد کشمیر رہا جہاں شریک حیات آزاد کشمیر یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں۔ 2002ء میں راولپنڈی آ گیا۔ یہیں اپنا گھر بنایا اور اب مستقل یہیں رہائش پذیر ہوں۔

سوال 2: نثری نظم آپ کا معتبر حوالہ ہے آپ نے اصنافِ سخن میں سے اس کا انتخاب ہی کیوں کیا؟

جواب: آپ کا یہ سوال یا قیاس بنیادی طور پر درست نہیں۔ میں نے کالج کے زمانے سے لکھنے کی ابتدا ہلکے پھلکے مضامین، غزلوں اور افسانوں سے کی جو اُس وقت کے اخبارات میں شائع بھی ہوئے۔ کیونکہ میرا بچپن گاؤں میں گزرا تھا اور فطرت میرے اندر ایک بڑی نظم کی صورت جاگزیں تھی۔ اس لیے نظم نگاری کی طرف میرا رجحان قدرتی تھا اور ابتدا ہی سے میں نے نظم نگاری کو مستقل ذریعہ ٔ اظہار بنا لیا تھا۔ 1974 / 75ء سے میری نظمیں اور غزلیں اُس دور کے اہم ادبی رسالوں میں شائع ہونے لگی تھیں۔ اسی (80) کی دہائی میں جب میں اسلام آباد میں تھا تو روزنامہ جنگ کے ادبی صفحہ میں میری نظمیں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں۔

(بقیہ اندرونی صفحات پر)

معروف ادیبہ وصحافی **آمنہ مفتی**
کے کاشانے پر اہل قلم کی کہکشاں

عامر بن علی کے اعزاز میں عصرانہ

فرخ سہیل گوئندی، رضا رومی، شاہد صدیقی، شعیب بن عزیز، ناصر عباس نیئر

صوفیہ بیدار، بلقیس ریاض، رخشندہ نوید، نیلم احمد بشیر، صدف مرزا، شازیہ مفتی

شعراء کرام نے اپنا تازہ کلام پیش کیا

اہل قلم کے علاوہ میڈیا سے منسلک اہم شخصیات نے شرکت فرمائی

براہ راست منگوانے کے لیے رابطہ کریں

نستعلیق Publications

غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com

Read Arxang online
www.amirbinali.com
www.millat.com